ریوتی سرن شرما کے بہترین ریڈیو ڈرامے

●

تعارف
کرشن چندر

●

انگریزی روزنامہ اسٹیٹسمین :- یہ ایک نیک شگون ہے کہ ہمارے ایک نوجوان نے اپنی تخلیقی سرگرمیاں ریڈیو ڈرامہ پر مرکوز کی ہیں۔ اب وہ بام عروج پر جا پہنچا ہے۔ ریوتی سرن شرما ایک سنجیدہ ڈرامہ نگار ہیں۔ ان کے پلاٹ عام ڈگر سے ہٹ کر ہوتے ہیں جن کی تعمیر وہ بڑی محنت سے کرتے ہیں۔ وہ ایسا کوئی تیر نہیں پھینکتے جو تکا بن کر رہ جائے۔ ان کا طرز نگارش الجھاؤ سے بری، بے حد پُر معنی ہے

●○●

انگریزی روزنامہ سنڈے اسٹینڈرڈ :- ریوتی سرن شرما کا شمار بڑی آسانی سے چوٹی کے ریڈیائی ڈرامہ نگاروں میں کیا جا سکتا ہے۔

●○●

ترتیب

آپ ان ڈراموں کو کھیل سکتے ہیں مگر

مصنف آپ سے توقع رکھتا ہے

کہ آپ مندرجہ ذیل پتہ پر اطلاع

دینے کی زحمت ضرور گوارا فرمائینگے۔

ریوتی سرن شرما

4-4-Z7 سروجنی نگر

نئی دِلّی

قیمت .. .. پانچ روپے

ناشر

مہندر ناتھ

مطبع: ہند سماچار پریس

جالندھر

ایشیا پبلشر

۵۔ بہار گولین

تیس ہزاری۔ دِلّی

سرلا کے نام ــــــــــ

جس نے مجھے جذبہ اور خیال
کی اُن منزلوں سے گزارا
جن سے اس کے بغیر میرا
گزر کبھی نہ ہوتا ــــــ

تعارف

آج ریوتی سرن شرما کا شمار ڈرامہ نگاروں کی صفِ اول میں ہوتا ہے۔ لیکن میں انہیں اُس زمانے سے جانتا ہوں، جب انہوں نے لکھنا شروع ہی کیا تھا۔ میں اُن کی ادبی کاوش کی مختلف زیر و بم دیکھ چکا ہوں۔ اس لئے مجھے اُن کے بارے میں لکھنے کا حق پہنچتا ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ وہ میرے دِل کے بہت قریب کہیں رہتے ہیں۔ اِس لئے ایسے آدمی کے بارے میں لکھنا اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ مگر جو مزا مشکل سازی میں ہے، وہ آسان نوازی میں نہیں ہے!

ریوتی سرن کے ڈراموں کو پڑھ کر سب سے پہلی بات جو ذہن میں آتی ہے، وہ حالات و کردار و تصورات کے بارے میں اُن کا جسارت آمیز تجزیہ ہے۔ یہ تجزیہ اس قدر کھُلا اور بے باک ہے، اس قدر سائنٹفک

اور جدید ہے کہ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ ایسا شخص جو اپنی زندگی میں اس قدر محتاط ہو، اس قدر پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہو، یعنی جو پیاز تک نہ کھاتا ہو۔ وہ زندگی کے زہر ہلاہل کو پینے کی جرأت کیسے کر سکتا ہے؟ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایسے انسان جو ایک طرف اس قدر احتیاط برتتے ہیں، دوسری طرف پھلانگ جانے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ یعنی ایک طرف سے جو انرجی بچا لیے ہیں، اسے تمام و کمال دوسری طرف داؤ پر لگا دینے کی اہلیت بھی رکھتے ہیں اور کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ صرف ایسے ہی لوگ یہ اہلیت رکھتے ہیں۔ اس کے بارے میں میری کوئی مستحکم رائے نہیں ہے مگر میں ریوتی کی شخصیت کے اس عجیب پر حیران ضرور ہوتا ہوں کہ یہ انسان جو زندگی کے بعض پہلوؤں میں اس قدر قدامت پسند ہے، اپنے خیالات اور اعتقادات کے سلسلے میں کس قدر ماڈرن واقع ہوا ہے۔

ریوتی کے ڈراموں کی تکنیک، موضوع، پیرایۂ بیان، کردار سازی، ماحول کا رنگ روپ اور بنیادی تصورات کی نہج بالکل جدید ہے۔ اور آج کے زمانے اور آج کے مسائل سے متعلق ہے۔ بہت سے ادیبوں سے میرا یہ جھگڑا بہت پرانا ہے کہ کہنے کو وہ تو یوں زمانہ حال کے کردار لیں گے، لیکن ان کو جب اپنے ڈرامے کی فضائے رنگ و بو میں رچائیں گے تو معلوم ہوگا کہ سولہویں صدی کے مسائل کا ذکر ہو رہا ہے۔ تاریخی اعتبار سے ایسے مسائل کو بھی اہمیت حاصل ہے مگر صرف تاریخی اعتبار سے۔ میں آثار قدیمہ کی افادیت کا قائل ہوں۔ مگر ایک پوری قوم

کو کمنڈروں میں تبدیل کر دینے کے حق میں نہیں ہوں۔ ریوتی کے ڈراموں میں یہی
بات مجھے سب سے زیادہ جاندار اور توانا معلوم ہوتی ہے کہ وہ اپنے ڈراموں
میں انتہائی دلچسپی سے اور کسی کو بور کئے بغیر کمالِ شدت سے آج کے مسائل
سے بحث کرتے ہیں۔ اور آپ کی آنکھوں کے سامنے ایسے کردار رکھتے
ہیں کہ موجودہ زمانے کی حقیقتوں کے کئی ایک ایسے رُخ جو اب تک آپ کی
نگاہوں سے اوجھل تھے یا جن پر پردہ پڑا ہوا تھا، یا جن کے بارے
میں آپ کے اندازے غلط تھے، اپنے صحیح خد و خال میں آپ کے
سامنے اُجاگر ہونے لگتے ہیں۔ ڈرامہ نگار کا کمال صرف یہی نہیں ہے
کہ وہ کرداروں سے بولے، بلکہ اُس کے ذریعے زندگی کی ایسی پرتیں بھی
کھولے جن سے آپ اب تک نا آشنا تھے، یا جن کی سچائی کو آپ نے
اب تک قبول نہیں کیا تھا۔ ریوتی نے یہ کام اپنے ڈراموں کے ذریعے
بحسن و خوبی پورا کیا ہے۔

اس مجموعے میں اُن کا پہلا ڈرامہ "دشمن" ہے جو دوسری محبت
کی اہمیت کا احساس دلاتا ہے۔ آج تک بالعموم پہلی محبت ہی کے بارے
میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ صرف اُسے قابلِ استغناء سمجھا گیا ہے۔
صرف اُسے ادب شاعری اور اخلاق کی معراج سمجھا گیا ہے۔ اور عورت
کے بارے میں اور بالخصوص ہندوستانی عورت کے بارے میں تو اس قدر قطعیت
سے کہہ دیا گیا ہے کہ وہ زندگی میں صرف ایک بار محبت کرتی ہے۔ ساری
زندگی صرف اُس سے محبت کئے جاتی ہے۔ یوں سوچئے تو یہ تخیل کس قدر

جان لیوا حد تک پیارا اور سُہانا معلوم ہوتا ہے۔ رومیو جولیٹ سے
ہیررانجھے تک اس موضوع پر کتنے ہی شاہکار لکھے گئے ہیں اور
لکھے جائیں گے۔ لیکن اگر حقیقت کو ذرا غور سے دیکھئے اور اسے
سچائی کی بھٹی میں اُتاریئے اور پارکھ۔ کے پتھر پر کس کر دیکھئے، تو معلوم
ہوگا کہ ایک محبت کے بعد دُوسری محبت بھی ہوتی ہے اور دوسری کے
بعد تیسری بھی ہوسکتی ہے۔ اور یہ جذبہ اپنے امکانات میں بہر صورت
شدید اور گہرا اور تہہ دار ہو سکتا ہے۔ ریوتی کے کردار سروج کے الفاظ
میں، جس نے دُوسری بار محبت کی ہے ——— "عورت بھی انسان ہوتی ہے۔
اس میں زندگی ہوتی ہے۔ اور زندگی مُردہ چیزوں کے سہارے نہیں،
زندہ چیزوں کے سہارے جیتی ہے۔ اس کی سُوکھی ڈالی کچھ دنوں
کے بعد پھر ہری ہونے لگتی ہے۔ ماں کا بچّہ مرتا ہے تو اُس وقت وہ
دوسرے بچّے کی بات بھی نہیں سوچ سکتی۔ لیکن جب دُوسرا بچّہ ہو جاتا
ہے تو اُسے پہلے جیسے پیار ہی سے چُومنے لگتی ہے!"

اس سے مجھے خیال آتا ہے کہ ریوتی اپنے ڈراموں میں عام
بول چال کی زبان تو استعمال کرتے ہی ہیں لیکن وہ اس بات کی بھی
ہمیشہ کوشش کرتے ہیں کہ ڈرامے کے تمام اشارے کنائے، استعارے
اور تشبیہیں بھی وہی لائیں جو نامانوس اور گراں بار نہ ہوں۔ جن سے قاری
کا ذہن بخوبی واقف ہو۔ جس طرح انہوں نے دوسری محبت کی صداقت کو
ماں کے دُوسرے بچّے کے پیار کی صداقت سے منوایا ہے، وہ ایسی

صداقت ہے جو ہر کس و ناکس کے دِل میں اُتر جائے گی۔ اور ڈرامہ نگار کا یہ پہلا فرض ہے کہ وہ ادق سے ادق بات کو اِتنی صفائی اور دلچسپی سے کہہ جائے کہ ایک ایسا ذہن بھی قبول کر لینے کو تیار ہو جائے جو اپنے تصورات اور اعتقادات کے اعتبار سے غیر معمولی نہ ہو۔ بات کو اِس طرح پیش کرنے کا اور پیش کر کے قائل کر دینے کا ڈھنگ ریوتی کو بہت آتا ہے۔ اس ڈھنگ کو وہ اکثر و بیشتر اپنی زندگی میں بھی برتتے ہیں۔ (جہاں وہ مجھے کبھی قائل نہیں کر سکے) مگر ان ڈراموں میں ان کی حیرت انگیز استعداد کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

اس استعداد کی ایک روشن مثال ان کا ڈرامہ "پتھر اور آنسو" ہے۔ (یہ نام بڑا ڈرامائی سا ہے۔ مگر ان دِنوں ناموں کا اس قدر کال پڑتا جا رہا ہے کہ لوگوں کو اپنی اولاد کے صحیح نام نہیں ملتے تو ڈراموں کے لئے کہاں سے ملیں گے) بہرحال نام سے قطع نظر اس ڈرامے کا موضوع بے حد انقلابی ہے۔ اس ڈرامے کا ہیرو ریوتی براہمن خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اور وہ ایک ایسی لڑکی سے محبت کرتا ہے جو کشتری خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ آپ کہیں گے، یہ کہاں کا انقلابی موضوع ہے حقیقت تو یہ ہے کہ اس دُنیا میں بہت سے لوگوں نے انقلاب کا مفہوم صرف سیاست سمجھا ہے اور وہ بھی صرف پستول کی گولی والی سیاست! حالانکہ اگر وہ ذرا سماج پر نظر ڈالیں گے اور اگر سماج پر نظر ڈالنے کی توفیق نہ ہو تو اپنے خاندان پر نظر ڈالیں گے۔ اور اگر اپنے خاندان پر نظر

ڈالنے کی توفیق نہ ہو تو اپنے گریبان ہی کو دیکھنے کی جرأت کر لیں گے۔ تو انہیں معلوم ہو گا کہ یہ کتنی بڑی بات ہے۔ وہ سماجی انقلاب جو یورپ میں دو سو سال پہلے آ چکا، ابھی ہمارے تمام بلند و بانگ وعدوں اور انقلابی نعروں کے باوجود ہمارے اذہان میں کبھی نہیں آیا۔ ہم لوگ بات کریں گے اشتراکیت کی لیکن شادی کریں گے اپنی ہی ذات میں! لے کر چلیں گے انسانیت اور اخوت اور مساوات کا جھنڈا اور جھنڈی دکھا دیں گے، اپنے خاندان کے سامنے!!
——— لہٰذا اس موضوع کی اہمیت سے ہم آج بھی انکار نہیں کر سکتے۔ اقرار کریں نہ کریں! ——— ریوتی نے اس ڈرامے میں ماں کے کردار سے جان ڈال دی ہے۔ باپ سخت گیر، بیٹا اپنے عقائد میں مستحکم۔ لیکن ماں کا کردار وہ کردار ہے۔ جو بدلتا ہے اور اپنے بیٹے کی محبت کی روشنی میں زندگی کی نئی روشنی دیکھ لیتا ہے۔ اس کردار سے ہم نئی حقیقت تک پہنچ جاتے ہیں اور یہ بھی معلوم کر سکتے ہیں کہ ہمارے خاندانوں کے پرانے افراد کے دلوں میں کیا اتھل پتھل ہو رہی ہے۔ وہ بھی بالکل جامد و ساکت، اپنے پرانے عقائد اور رسومات کی سختی سے تائید کرتے ہوئے کردار نہیں ہیں۔ بلکہ سماج کی نئی حقیقتوں سے ان کے عقائد میں بھی شکست و ریخت ہو رہی ہے۔ گو وہ اپنی تبدیلی کو اس خوبصورت محاورے میں پیش کرتے ہیں، جو صدیوں سے چلا آیا ہے۔ اور یہ ایک طرح سے بہت اچھا ہے۔ اس سے ریوتی کے سخت گیر باپ کو اس نئی شادی کے لیے منوایا جا سکتا ہے۔ اور اس کے ساتھ یہ احساس بھی زندہ رکھا جا سکتا ہے کہ کوئی

خاص تبدیلی نہیں ہو رہی ہے۔ ظاہر ہے ماں سے زیادہ خوبصورتی اور گھریلو پن سے اس کام کو اور کوئی کردار سرانجام نہیں دے سکتا تھا۔ روی کے رویے میں ٹھوس ازلیت ہے جو قاری کو تو قائل کر جاتی ہے لیکن ضدی باپ کو اور بھڑکا دیتی ہے۔

روی ۔ چاچا جی میں آپ سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔ مگر میں اتنا ضروری کہوں گا کہ میں آدمی آدمی میں محض پیدائش اور ذات کی بناء پر فرق کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ نہ براہمن آم کا پیڑ ہے، نہ دوسری ذات کے لوگ، نیم کے درخت۔ سب کا خون یکساں طور پر پاکیزہ ہے۔ خون صرف بیمار کا خراب ہوتا ہے!"

لیکن ماں کا رویہ بالکل مختلف ہے اور وہی رویہ جیتنے اور بدلنے والا ہے۔

ماں۔ "تم کن سے ٹکر لینے چلے ہو؟ اپنوں سے؟ بھلا کوئی اپنوں سے لڑا ہے؟ کوئی اپنوں سے جیتا ہے؟ اور جو جیتا ہے۔ وہ اپنوں کو توڑ کر، اپنوں کو ہرا کر کبھی خوش ہوا ہے؟ تم اُن کی جیت کو اپنی جیت کیوں نہیں سمجھتے؟ اُن کی ہار کو اپنی ہار کیوں نہیں سمجھتے؟ آخر وہ کس کے ہیں؟ کیا وہ تمہارے اپنے ہی نہیں ہیں؟"

ایک اور جگہ اسی انداز میں، اسی گھریلو سیدھے سادے انداز میں اپنے شوہر کو سمجھاتی ہے کہ اگر اُس کا بیٹا نئے راستے پر چلنا چاہتا ہے، تو اُس میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔

ماں ۔ یہ تو جگ کی رِیت ہے ۔ برگد بھی بوڑھا ہو جاتا ہے تو اُس کے تنے بوڑھی جڑ کا سہارا لینے کے بجائے اپنی جڑیں الگ جما لیتے ہیں۔ تم کو تو خوش ہونا چاہیئے کہ تمہارے گدّے اور تنے تمہاری طرح ہیں۔ ان میں تمہاری ہی طاقت اور تُرشی ہے ۔ وہ تمہاری ہی طرح دُنیا کے راستے پر چلنے کے بجائے دنیا کو اپنے راستے پر چلاتے ہیں ۔ وہ جھکتے نہیں ہیں ۔ دُنیا کو جُھکاتے ہیں !"

اِنقلاب ایک فطری عمل ہے اور اس کائنات کا دستور اور اس جگ کی رِیت ! اسے ایک ماں کی زبان سے سُننا بہت اچھا معلوم ہوتا ہے !

" رات بیت گئی" میں بھی اِسی موضوع کی تکرار ہے ۔ اور "آگ، راکھ، روشنی" کے ڈرامے کے ایک فلیش بیک میں بھی زبردستی کی شادی کے خلاف احتجاج کیا گیا ہے معلوم ہوتا ہے۔ اس موضوع کا ریوتی نے بہت گہرا اثر لیا ہے، جو ایک حد تک ان کی زندگی کے واقعات اور تجربات میں سمویا ہُوا ہے ۔ اس لیئے وہ ڈراموں میں گھر کے مختلف افراد کی ذہنی کشاکش کو اس خوبصورتی اور صاف گوئی سے بیان کر سکے ہیں ۔ "آگ، راکھ اور روشنی" میں تو خیر اس کشمکش کا بیان ضمنی ہے، اُس کا موضوع ہی دُوسرا ہے لیکن " رات بیت گئی" اور "پتھر اور آنسو" کے موضوع میں بڑی مماثلت ہے ۔ گو کردار مختلف ہیں اور

ماحول اور ماحول کا رنگ رُوپ بھی بالکل الگ ہے۔

"رات بیت گئی" کی ہیروئن ایک کمزور جذباتی لڑکی ہے ——— جو واقعات اور حالات کے دھارے پہ کاغذ کے ایک ٹکڑے یا گھاس کے ایک تنکے کی طرح بہتی ہے۔ ایسی لڑکیاں ہمارے متوسط گھرانوں اور غریب خاندانوں میں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ اور ہمارے سماج کی شرافت کا معیار بھی ایسی ہی لڑکیاں قرار پاتی ہیں، جن کی اپنی زندگی ہوتی ہے لیکن عقل ماں باپ سے مستعار لی جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آخر میں اُن کی اپنی کوئی زندگی بھی نہیں رہتی۔

تارا ایک ایسی لڑکی ہے، جس کی شادی اُس کے غریب ماں باپ اُس کی مرضی کے خلاف ایک بوڑھے سے کر دیتے ہیں۔ بڈھے کی موت کے بعد وہ لڑکی پھر اپنے میکے کا بوجھ بن کر واپس آجاتی ہے۔ اس بوجھ کو ہلکا کرنے کے لئے میکے والے پھر اُس بیوہ کی شادی ایک پان فروش سے کر دیتے ہیں، جو اس شرط پہ شادی کے لئے راضی ہو جاتا ہے کہ بیوہ اس کے گھر میں پہلے شوہر کے بچے کو نہ لائے۔ بیوہ کا دِل اپنے بچے کے لئے تڑپتا ہے۔ مگر وہ پان فروش تارا کے الفاظ میں :-

"تارا :- وہ سچ مچ تمباکو کی طرح کڑوا اور چونے کی طرح تیز تھا۔ چونکہ پان بیچتے ہوئے اُس نے یہی سیکھا تھا کہ جو نرم ملائم اور رچکیلا ہوتا ہے، وہ گھٹیا پان ہوتا ہے، اس لئے وہ بھول ہی گیا تھا کہ

نرمی، کوملتا اور لچک بھی اچھی چیزیں ہوتی ہیں۔ وہ ہر چیز کو پان کی طرح کونے پر سے موڑ کر اور توڑ کر دیا سکتا تھا.....“

اس سے آپ کو پھر اندازہ ہو جائے گا کہ ریوتی اپنے ڈراموں میں براہ راست زندگی کی تشبیہیں اور استعارے استعمال کرتے ہیں ـــــ جانے پہچانے اور سیدھے سادے، لیکن ایک ایسے نئے انداز میں جو چبھتا ہے، کھُبتا ہے اور ہلکا سا درد بھی پیدا کرتا ہے۔ ریوتی اپنے ڈراموں میں انتہائی صاف گو اور کبھی کبھی اپنی زندگی میں بھی مصیبت کی حد تک صاف گو انسان ہیں۔ کچھ لوگ واقعات پر جذبات کی پرتیں چڑھا کر اُسے جھلمل شفّاف دھند لکوں میں دیکھتے ہیں۔ ریوتی جذبات کی پرتیں الگ کرتے جاتے ہیں اور واقعات اور حقیقتوں کو ننگا کر دیتے ہیں۔ معلوم نہیں اِن حضرت کو عریانی سے ایسی کون سی دلچسپی ہے۔ حالانکہ خود کپڑے پہنتے ہیں ؟

گہرہ ذکر تارا کا ہو رہا تھا۔ بدنصیب تارا دُوسرے شوہر کے گھر سے بھی اپنے پہلے شوہر کے بچے کی محبّت کی بنا پر نکالی جاتی ہے۔ اور یہ اُس وقت ہوتا ہے۔ جب وہ اپنے دُوسرے شوہر کا بچہ اپنے پیٹ میں پال رہی تھی۔ اس موقع پہ اس کی پُرانی سہیلی جو اب لیڈی ڈاکٹر بن چکی ہے، اُس کے آڑے آتی ہے اور اُس کی مدد کرتی ہے۔ اور اُسے اپنے پاؤں پہ، اپنی شخصیت پر، اپنی محبت پر کھڑا ہونے کی تلقین کرتی ہے۔

لیڈی ڈاکٹر:- "تارا اگر تیرا اِتنا ہی مول ہے تو اپنے کو مجھے دے دے۔ پھر میں دکھاتی ہوں کہ میں تجھے کیا بناتی ہوں۔ تارا عام عورتوں کی طرح تو نے بھی اپنی قدر نہ جانی۔ میں تجھ سے ایک بات پوچھتی ہوں، تو نے جو اِتنی محنت کی، اِتنا اپمان اور آتما کا ہنن سہا۔ کس لئے سہا؟ صرف دو روٹی اور تن ڈھانپنے کا کپڑا پانے کے لئے؟ لیکن ذرا یہ تو سوچ کہ اگر تو یہ سب کچھ نہ کرتی۔ ماں باپ پتی سب کو ٹھوکر مار کر اپنی دُنیا آپ بسانے کے لئے چل دیتی۔ تو کیا مزدوری کر کے، سلائی کر کے، اسکول میں پڑھا کر اِتنی روٹی، اِتنا کپڑا نہ حاصل کر سکتی تھی؟ ان ترس کار بھری روٹیوں کے لئے جتنی بھاری قیمت تو نے ادا کی ہے، اُتنی قیمت میں تو تجھے پورا جہان مل جاتا۔

ریوتی کے ڈرامے میں بدلتی ہوئی ہندوستانی عورت، کمزور اور بے عقل عورت، پرانی ڈگر پہ بھیڑ بکری کی طرح چلائی جانے والی عورت کی بدلتی ہوئی شخصیت اور ایک بہتر شخصیت کا پرتو صاف صاف نظر آنے لگتا ہے۔

اب تک میں نے صرف گھریلو قسم کے ڈراموں کا ذکر کیا ہے۔ اس سے یہ بھی ممکن ہے کہ آپ نے ریوتی کے کمالِ فن کے متعلق غلط قسم کے اندازے قائم کر لئے ہوں۔ منہ کا مزا بدلنے کے لئے اس کے جدید ترین قسم کے ڈرامے کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ یہ ڈرامہ تکنیک کے اعتبار سے جدید ترین نہیں ہے لیکن حقیقت کے اعتبار سے جدید ترین ہے۔ یہ ڈرامہ آزادی

کے بعد کے مہذب چوروں سے متعلق ہے یعنی ایسے افراد سے جو ہندوستان کی راجدھانی دِلّی میں اور دُوسرے بڑے بڑے شہروں میں ناجائز طریقوں سے پرمٹ اور ٹھیکے حاصل کرتے ہیں ـــــ افسروں کو کمیشن کھلا کر یا لڑکیاں پیش کر کے یا دونوں ہی طریقے استعمال کر کے! گرلیش ایک ایسا ہی کمیشن ایجنٹ ہے۔ اس کا کردار بہت جاندار ہے کیونکہ شیطان کا ہے۔ اور انسان کی نفسیات کا کچھ عجیب عالم ہے کہ اُسے یزداں کے مقابلے میں اہرمن سے زیادہ دلچسپی رہی ہے۔ دیکھیے کس سفاکی سے ریوتی آج کی ظالم حقیقتوں پر سے نقاب اُٹھاتا ہے۔ اور خود گرلیش کے الفاظ میں اس کا کردار بیان کرتا ہے۔

گرلیش :۔ جانتی ہو میری تین پشتیں آتما پرماتما کے چکر میں پڑ کر ایمانداری کا تجربہ کرتی رہیں اور بھوکی مرتی رہیں۔ جب میں نے ہوش سنبھالا اور دیکھا۔ ہمارا سب کچھ اس نیکی کے بھینٹ چڑھ چکا ہے اور دُنیا جوں کی توں ہے تو میں اپنی آتما کو اپنے پِتا کی ہڈیوں کے ساتھ گنگا میں بہا کر اِسی شہر میں چلا آیا۔ اور جب سے اس آتما سے مکتی پائی ہے، ایسا محسوس کرتا ہوں، جیسے گلے کے بڑھے ہوئے غدود کا آپریشن کرا کے نزلے، بخار سے ہمیشہ کے لئے نجات پا گیا ہوں"۔

گرلیش کے مقابلے میں تارا کا شوہر کشور ہے۔ وہ سرکاری دفتر میں مشین کا ایک پُرزہ ہے لیکن ایماندار ہے۔ جب منافع خور سرمایہ دار کشور کے ضمیر کو خرید نہیں سکے تو وہ اُس کی کمزور لیکن خوبصورت بیوی تارا

پر حملہ کرتے ہیں۔ پانسو روپے کی نوکری سے، زیور سے، موٹر کی چمک سے اور بدقسمت تارا (نہ جانے اس نام میں ریوتی کو کیا دلچسپی ہے کہ کئی ڈراموں میں آتا ہے) گریش کا آبڑ کاربن کرا پنے شوہر کی محبت کھو دیتی ہے۔

کشور:۔ "اب تم مجھ سے کبھی محبت نہیں کر سکتیں۔ اب تم صرف اُس کشور کو چاہ سکتی ہو، جس کے کاندھوں پر جینیت کا کوٹ ہو۔ سر پر گریش کا ہیٹ ہو۔ مُنہ میں چرپڑہ کا سگریٹ ہو اور شخصیت میں ان لوگوں کا پرتو ہو، جنہیں تم نے کاروں سے اُترتے اور ہوٹل کی سیڑھیوں پر چڑھتے دیکھا ہے!" ——— اور جب اس کے باوجود تارا نہیں مانتی اور اپنی محبت کا یقین ان الفاظ میں دلاتی ہے ——— "لیکن اس کے باوجود میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ تم سے پہلے جتنی محبت کرتی ہوں" ——— تو کشور کہہ اُٹھتا ہے۔

کشور۔ "یہ غلط ہے تارا ——— محبت تو چراغ کی ایک جھلملاتی لَو ہے۔ ایک پتلی کمزور سی لَو۔ لیکن اس لَو کی زندگی اور روشنی بھی خیال کے دم سے ہے۔ جب دو ہاتھ مل کر خیال کی چمنی کو اِس لَو پر رکھ دیتے ہیں تو یہ دمک اُٹھتی ہے۔ لیکن جب وہ ہاتھ اِس چمنی کو اُتار کر پھینک دیتے ہیں، تو یہ پھر بیوہ ہو جاتی ہے۔ تارا ہماری تمہاری محبت کا سہاگ اُجڑ چکا ہے!"

دِلّی کی گلیوں میں آج جیتے جی کتنے ہی ایسے سہاگ اُجڑ رہے ہیں۔ ——— ریوتی نے اس ڈرامے میں اسی خطرناک "لیپٹ" کی طرف اِشارہ کیا ہے!

یہ سب ڈرامے جن کا مَیں نے اُوپر ذکر کیا ہے، بہت اچھے اور خوبصورت ہیں، اور حیرت انگیز صفائی اور چابکدستی سے بُنے گئے ہیں۔ لیکن اس مجموعے کی معراج وہ تین ڈرامے ہیں۔ جن کا ذکر مَیں اب کرنا چاہتا ہوں۔ "انسان"، "کل" اور "آگ، راکھ اور روشنی"——— دراصل ان تمثیلی ڈراموں میں ریوتی کا فن پُورے طور پر نکھر کر شباب پر آیا ہے۔ "کل" میں اُس آنے والے کل کا ماتم ہے جب دُنیا ایٹمی جنگ سے تباہ ہو سکتی ہے اور اس کی مہیب کاریوں کے نتیجے میں پُوری انسانی نسل تباہ اور مسخ ہو سکتی ہے۔ اس حد تک کہ تین آنکھوں والے اور دو سروں والے بچے پیدا ہونے لگیں۔ ریوتی نے اِس ڈرامے میں مستقبل کے خدشات کی ایسی ہولناک تصویر کھینچی ہے کہ دِل لرز لرز جاتا ہے۔ یہاں پر ریوتی کے اندازِ بیان میں بھی تلوار کی سی کاٹ ہے اور مشین گن کی سی بے رحمی ہے ——
چند مثالیں پیش کرتا ہوں :-

کرنل - "سارجنٹ! وہ دیکھو۔۔۔ دو معانی کے بیچ میں سے بہتی ہوئی ندی دُھوپ میں ننگی تلوار کی طرح چمک رہی ہے۔"

میجر - "عام آدمی کی دُنیا میں جنگ کے لئے کوئی گنجائش نہ تھی۔ بجُز رنج والم اُس نے جنگ سے کوئی توقع وابستہ نہیں کی تھی۔ جنگ اُس کے سر پر اس طرح منڈھ دی گئی تھی، جس طرح میرے شانوں پر یہ خاکی وردی!

البقعا۔ "محبت تم نے صرف ہتھیاروں سے کی۔ عورت کو تم نے فوجی راشن کی چیز سمجھا ہے۔ تم انسان نہیں ہو۔ گوشت پوست کے ایک آٹومیٹک ہتھیار ہو۔ دُنیا تمہارے لئے یا تو فوجی بیس ہے یا چاند ماری کا میدان!"

اُس مہیب دُنیا میں جب فوجی کرنل عام لوگوں کی ضروریات معلوم کرنے کے لئے عام لوگوں کے پاس جاتا ہے تو ایک نوجوان عورت اپنا بچہ اُٹھائے ہُوئے اس کے پاس آتی ہے اور اسی سے شدّت بھری آواز میں کہتی ہے۔

عورت۔ "تو لکھو، لکھو۔ میرے بچّے کو دودھ چاہیئے، بسکٹ چاہیئے، برانڈی چاہیئے، ایک پالنا چاہیئے، ایک چھوٹا سا خوبصورت مکان چاہیئے اور ایک لمبی سی زندگی چاہیئے۔ جسے کوئی جنگ، بم، ایٹم بم، کبھی ختم نہ کر سکے!"

لیکن اس ڈرامے کا سب سے مہلک حملہ آخری سین میں ہوتا ہے جب چٹان کی طرح مضبوط اور بے رحم دِل بھی ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ آج خود اُس کے گھر میں ایک مسخ شدہ بچہ پیدا ہُوا ہے۔ اُس وقت جنرل رو کر کہتا ہے:۔

جنرل "اوہ کرنل۔ یہ ہم نے کیا کر ڈالا۔ اس ایٹم نے ہمیں کہاں سے کہاں جا پہنچایا۔" اس وقت کرنل کے الفاظ نہ صرف ڈرامہ نگار بلکہ آج کے ہر اُس انسان کی آواز بن جاتے ہیں، جو زندگی چاہتا ہے اور زندگی سے پیار کرتا ہے۔

کرنل۔ "جنرل، اپنے الزام سے بچنے کی کوشش نہ کرو۔ جب ہم نے ایٹم توڑا تھا تب کیا اُس نے ہم سے کہا تھا ——— 'میری جہاں سوز طاقت سے اپنی سیاسی رقابت اور نسلی منافرت کی آگ بجھاؤ'؟ تم اِس کی آگ سے پہاڑوں کے دِل پگھلا سکتے تھے۔ زمین سے اس کے سارے خزانے اُگلوا سکتے تھے۔ ستاروں اور سیاروں سے اُنکے راز افشا کروا سکتے تھے لیکن اُس وقت تم نے یہ بھی نہ سوچا۔ اور اب۔ اب تم پھر اِس راستے پر جا رہے ہو۔ جنرل اپنی تاریخ کے گزرے کل سے اُس کل کے لیئے سبق لو، جو اِتفاق سے بچ رہا ہے۔ اور اس حال کے بعد آنے والا ہے!"

ریوتی کا جی اُن بحثوں میں بہت اُلجھتا ہے، جو ہزاروں سال سے اِنسانی عقل و ضمیر کے سربستہ راز بن چکی ہیں اور عقدہء لاینحل کی صورت اِختیار کر چکی ہیں۔ وہ آج کی سائنس اور آج کے فہم و ادراک کا سہارا لے کر اُن عقدوں کو پھر سے حل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنی پوری ڈرامائی قوت اُن میں صرف کر دیتا ہے شاید اس میں اُس کی خاندانی روایت بھی اُکساتی ہوگی، کیونکہ ریوتی خود ایک اُونچے براہمنی خاندان سے ہے۔ شاید اُسے وہ رِشی مُنی اُکساتے ہوں گے جنہوں نے آج سے سینکڑوں بلکہ ہزاروں برس پہلے وہ شاستر لکھے تھے، جن میں پہلی بار کائنات کی اہمیت سے بحث کی گئی تھی۔ "آگ، راکھ اور روشنی" میں خدا اور ضمیر اور اندر کی آواز ایسے ادق مسائل کو ایک عام آدمی کی زندگی سے تعبیر کر کے اُنہیں ڈرامائی حقیقت کا جامہ پہنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ میرے خیال میں اس سے پہلے کی کوئی

کوشش اتنی کامیاب نہیں ہے، جتنی ریوتی کی یہ دو کاوشیں کامیاب ہیں۔ "آگ، راکھ اور روشنی" اور "انسان"۔ اور ان دونوں میں بھی میں "انسان"، کو سب سے افضل اور ریوتی کے تمام ڈراموں میں سب سے اچھا سمجھتا ہوں یہاں اُس کے ذہنی کی وراثت اور روایت نے سائنس کی بغاوت کو سمو کر اُن نئی حقیقتوں کی طرف اشارہ کیا ہے، جہاں اب انسان کا ذہن پہنچ رہا ہے۔ سب گوشے صاف نہیں ہوتے ہیں۔ ساری تاریکیاں منور نہیں ہوئی ہیں۔ لیکن روشنی نظر آتی ہے۔ اور اُجالا بڑھتا اور پھیلتا جا رہا ہے۔ ان دونوں ڈراموں میں ریوتی کا تجزیہ نشتر کی طرح تیز اور پرومیتھس کی طرح جسارت آمیز ہے!

راماداس :۔ "میں صرف آتما کی آواز سنوں گا۔

موہن لال :۔ "راماداس۔ اگر تم عقل کے راستے سے ہٹ کر آتما کے راستے پر جانا چاہتے ہو، تو تمہیں بتانا ہوگا، کہ یہ آتما کیسی ہے، جو عقل کی عدم موجودگی میں انسان کو پاگل اور احمق ہونے سے نہیں بچا سکتی۔ عقل کے گم ہو جانے پر انسان کو ہوش و حواس میں بھی نہیں رکھ سکتی۔

موہن لال :۔ "یہی وہ کیلے کا چھلکا ہے، جس پر تم پیر رکھنے سے پھسل گئے۔ یہ درست ہے کہ انسان کے اندر سے عقل کے علاوہ بھی ایک آواز آتی ہے۔ لیکن یہ غلط ہے کہ یہ آواز سچائی اور نیکی کا راستہ دکھاتی ہے۔"

رامداس ۔ کیوں، کس لئے ؟

موہن لال ۔ اس لئے کہ یہ آواز سب کے اندر سے ایک جیسی نہیں آتی۔ یہ آواز ایک کو وہ راستہ دکھاتی ہے، جسے ہم صحیح کہتے ہیں۔ دوسرے کو وہ راستہ جسے ہم صریحاً غلط کہتے ہیں۔ یہ آواز ہر انسان، ہر زمانہ، ہر علاقے، اور اکثر ہر موقع کے ساتھ بدلتی رہتی ہے !"

"آگ، راکھ اور روشنی"

اور یہ خدا کے لئے.......

موہن لال ۔ رامداس تم نے اتم غلتم خیالات کی گولیاں شاید اندھا دھند کھالی ہیں ۔ تبھی تم ایسی باتیں کر رہے ہو ۔ کیا تم اُس بھگوان کو بھگوان کہتے ہو، جو اس انتظار میں ہے کہ معصوم مرتے رہیں، مجرم پنپتے رہیں، اور جب اس دنیا میں صرف مجرم ہی رہ جائیں یا تمہارے الفاظ میں پاپ کا گھڑا پوری طرح بھر جائے تب وہ آئے اور اپنے انصاف کی بجلی سے اُس ہستی کو جلا کر خاک کر دے ۔ رامداس اگر تمہارا بھگوان ایسا ہی ہے، تو وہ اس سپاہی کی طرح گولی سے اڑا دینے کے لائق ہے، جو اس انتظار میں کھڑا رہتا ہے کہ پہلے مجرم جرم کا ارتکاب کر لے، اس کے بعد وہ عمل میں آئے گا !"

(آگ، راکھ اور روشنی)

لیکن یہ تو ہلکی ہلکی، دبی دبی سی چپکیاں ہیں جو بالآخر ڈرامہ نگار کے تفکر کے منطقی نتیجے کے طور پر "انسان" میں اپنے انجام کو پہنچتی ہیں۔ "انسان"

اس مجموعے کا بہترین ڈرامہ ہے اور تمثیلی انداز میں لکھا گیا ہے۔ اور اسے اس انداز کے ڈراموں میں بڑی آسانی سے صفِ اوّل میں رکھا جا سکتا ہے۔

"انسان" میں ایک ڈاکٹر مر رہا ہے۔ مرتے وقت اُس کے ذہنی ہیولے میں کائنات کے مختلف مظہر اپنی جبروت کی انتہائی شدّت کے ساتھ اُجاگر ہوتے ہیں۔ مرتے ہوئے ڈاکٹر کو جو ایک فلسفی کا ذہن اور موجودہ سائینس کا مکمل ادراک رکھتا ہے، سب سے پہلے وقت ڈراتا ہے۔ پھر مذہب آکے ڈراتا ہے اور آخر میں موت آکے ڈراتی ہے، مگر ڈاکٹر کو اپنے علم کی روشنی میں، عرفان، نروان، سکون، جو کچھ بھی کہیے، نصیب ہو چکا ہے۔ اور وہ ان ہیولوں میں سے کسی سے نہیں ڈرتا اور پُرسکون انداز میں اپنے اختتام کی طرف بڑھتا ہے۔ کیونکہ ڈرامہ نگار کے الفاظ میں :-

ڈاکٹر۔ مَیں مر کر بھی نہیں مروں گا۔ ذرا سوچو کہ تمہاری اصطلاح میں مر کر بھی میرا کیا ہو گا؟ یا تو مَیں دفن کیا جاؤں گا یا جلا دیا جاؤں گا۔ قبر میں دب کر میرا جسم خاک بن جائے گا۔ آگ میں جل کر گیس اور راکھ بن جائے گا۔ کھاد اور راکھ سے سبزہ اُگے گا۔ گیس سے بادل بن کر مینہہ برسے گا اور سبزہ کو پروان چڑھائے گا ـــــ اس طرح مَیں مرنے اور مٹنے کے بجائے تازہ اور مختلف روپوں میں اظہار پا جاؤں گا!"

(انسان)

اور ـــــ "مَیں پھر اور پھر پیدا ہوتا رہوں گا اور ہر بار جب

پیدا ہوں گا تو پہلے سے زیادہ جوان اور تابناک ہوں گا۔"

یہ فلسفۂ حیات عینیت سے کس قدر دُور ہے اور کس قدر اُمید افزا ہے۔ یہی جوانی اور توانائی ریوتی سرن شرما کے فن کا اصلی جوہر ہے۔ اگر وہ واقعی ڈرامے کے میدان میں اِسی طرح جسارت آمیز تجربے کرتے رہے تو ادبی موت انہیں چھو نہ سکے گی اور اُن کے فن کا حُسن ایلورا کے پتھروں کی طرح زندہ جاوید ہو جائے گا۔

کرشن چندر۔ دِلّی
۲۳ جنوری ۱۹۶۱ء

پر حملہ کرتے ہیں۔ پانسو روپے کی نوکری سے، زیور سے، موٹر کی چمک سے اور بدقسمت تارا (نہ جانے اس نام میں ریوتی کو کیا دلچسپی ہے کہ کئی ڈراموں میں آتا ہے) گریش کا آبزٹ کاربن کرا پنے شوہر کی محبت کھو دیتی ہے۔

کشور:۔ "اب تم مجھ سے کبھی محبت نہیں کر سکتیں۔ اب تم صرف اُس کشور کو چاہ سکتی ہو، جس کے کاندھوں پر جینیٹ کا کوٹ ہو۔ سر پر گریش کا ہیٹ ہو۔ منہ میں چوپڑہ کا سگریٹ ہو اور شخصیت میں ان لوگوں کا پرتو ہو، جنہیں تم نے کاروں سے اترتے اور ہوٹل کی سیڑھیوں پر چڑھتے دیکھا ہے!" ——— اور جب اس کے باوجود تارا نہیں مانتی اور اپنی محبت کا یقین ان الفاظ میں دلاتی ہے ——— "لیکن اس کے باوجود میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ تم سے پہلے جیسی محبت کرتی ہوں" ——— تو کشور کہہ اٹھتا ہے۔

کشور۔ "یہ غلط ہے تارا ——— محبت تو چراغ کی ایک جھلملاتی لو ہے۔ ایک پتلی کمزور سی لو۔ لیکن اس لو کی زندگی اور روشنی بھی خیال کے دم سے ہے۔ جب دو ہاتھ مل کر خیال کی چمنی کو اس لو پر رکھ دیتے ہیں تو یہ مہک اٹھتی ہے۔ لیکن جب وہ ہاتھ اس چمنی کو اتار کر پھینک دیتے ہیں، تو یہ پھر بیوہ ہو جاتی ہے۔ تارا ہماری تمہاری محبت کا سہاگ اُجڑ چکا ہے!"

دِلی کی گلیوں میں آج جیتے جی کتنے ہی ایسے سہاگ اُجڑ رہے ہیں۔ ——— ریوتی نے اس ڈرامے میں اسی خطرناک، لیٹے کی طرف اشارہ کیا ہے!

یہ سب ڈرامے جن کا میں نے اُوپر ذکر کیا ہے، بہت اچھے اور خوبصورت ہیں، اور حیرت انگیز صفائی اور چابکدستی سے بُنے گئے ہیں۔ لیکن اس مجموعے کی معراج وہ تین ڈرامے ہیں۔ جن کا ذکر میں اب کرنا چاہتا ہوں۔ "انسان!" "کل" اور "آگ" راکھ اور روشنی"۔۔۔۔ دراصل ان تمثیلی ڈراموں میں ریوتی کا فن پُورے طور پر نکھر کر شباب پر آیا ہے۔ "کل" میں اُس آنے والے کل کا ماتم ہے جب دُنیا ایٹمی جنگ سے تباہ ہو سکتی ہے اور اس کی مہیب کاریوں کے نتیجے میں پُوری انسانی نسل تباہ اور مسخ ہو سکتی ہے۔ اس حد تک کہ تین آنکھوں والے اور دو سروں والے بچے پیدا ہونے لگیں۔ ریوتی نے اِس ڈرامے میں مستقبل کے خدشات کی ایسی ہولناک تصویر کھینچی ہے کہ دِل لرز لرز جاتا ہے۔ یہاں پر ریوتی کے اندازِ بیان میں بھی تلوار کی سی کاٹ ہے اور مشین گن کی سی بے رحمی ہے۔۔۔ چند مثالیں پیش کرتا ہوں :۔

کرنل :۔ "سارجنٹ! وہ دیکھو۔۔۔ حدِ معانی کے بیچ میں سے بہتی ہوئی ندی دُھوپ میں ننگی تلوار کی طرح چمک رہی ہے۔"

میجر :۔ "عام آدمی کی دُنیا میں جنگ کے لئے کوئی گنجائش نہ تھی۔ بجز رنج والم اُس نے جنگ سے کوئی توقع وابستہ نہیں کی تھی۔ جنگ اُس کے سر پر اس طرح منڈھ دی گئی تھی، جس طرح میرے شانوں پر یہ خاکی وردی!

البغا۔ "محبت تم نے صرف ہتھیاروں سے کی۔ عورت کو تم نے فوجی راشن کی چیز سمجھا ہے۔ تم انسان نہیں ہو۔ گوشت پوست کے ایک آٹومیٹک ہتھیار ہو۔ دُنیا تمہارے لئے یا تو فوجی میس ہے یا چاند ماری کا میدان!"

اُس تہذیب دُنیا میں جب فوجی کرنل عام لوگوں کی ضروریات سے معلوم کرنے کے لئے عام لوگوں کے پاس جاتا ہے تو ایک نوجوان عورت اپنا بچّہ اُٹھائے ہُوئے اس کے پاس آتی ہے اور اسی سے شدّت بھری آواز میں کہتی ہے۔

عورت۔ "تو لکھو، لکھو۔ میرے بچّے کو دودھ چاہیئے، بسکٹ چاہیئے، برانڈی چاہیئے، ایک پالنا چاہیئے، ایک چھوٹا سا خوبصورت مکان چاہیئے اور ایک لمبی سی زندگی چاہیئے۔ جسے کوئی جنگ، بم، ایٹم بم، کبھی ختم نہ کر سکے!"

لیکن اس ڈرامے کا سب سے مہلک حملہ آخری سین میں ہوتا ہے جب چٹان کی طرح مضبوط اور بے رحم دِل بھی ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ آج خود اُس کے گھر میں ایک مسخ شدہ بچّہ پیدا ہُوا ہے۔ اُس وقت جنرل رو کر کہتا ہے:۔

جنرل "آہ، او کرنل۔ یہ ہم نے کیا کر ڈالا۔ اس ایٹم نے ہمیں کہاں سے کہاں جا پہنچایا۔" اس وقت کرنل کے الفاظ نہ صرف ڈرامہ نگار بلکہ آج کے ہر اُس اِنسان کی آواز بن جاتے ہیں، جو زندگی چاہتا ہے اور زندگی سے پیار کرتا ہے۔

کرنل۔ "جنرل، اپنے الزام سے بچنے کی کوشش نہ کرو۔ جب ہم نے ایٹم توڑا تھا تب کیا اُس نے ہم سے کہا تھا ——— 'میری جہان سوز طاقت سے اپنی سیاسی رقابت اور نسلی منافرت کی آگ بجھاؤ'؟ تم اِس کی آگ سے پہاڑوں کے دِل پگھلا سکتے تھے۔ زمین سے اس کے سارے خزانے اگلوا سکتے تھے۔ ستاروں اور سیاروں سے اُنکے راز افشا کروا سکتے تھے لیکن اُس وقت تم نے یہ بھی کچھ نہ سوچا۔ اور اب۔ اب تم پھر اِس راستے پر جا رہے ہو۔ جنرل اپنی تاریخ کے گزرے کل سے اُس کل کے لئے سبق لو، جو اِتفاق سے بچ رہا ہے۔ اور اس حال کے بعد آنے والا ہے!"

ریوتی کا جی اُن بحثوں میں بہت اُلجھتا ہے، جو ہزاروں سال سے اِنسانی عقل وضمیر کے سربستہ راز بن چکی ہیں اور عقدہ لاینحل کی صورت اِختیار کر چکی ہیں۔ وہ آج کی سائنس اور آج کے فہم و ادراک کا سہارا لے کر اُن عقدوں کو پھر سے حل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنی پوری ڈرامائی قوت اُن میں صرف کر دیتا ہے۔ شاید اس میں اُس کی خاندانی روایت بھی اُکساتی ہوگی، کیونکہ ریوتی خود ایک اُونچے براہمنی خاندان سے ہے۔ شاید اُسے وہ رشی مُنی اُکساتے ہوں گے۔ جنہوں نے آج سے سینکڑوں بلکہ ہزاروں برس پہلے وہ شاستر لکھے تھے، جن میں پہلی بار کائنات کی اہمیت سے بحث کی گئی تھی۔ "آگ راکھ اور روشنی" میں خدا اور ضمیر اور اندر کی آواز ایسے ادق مسائل کو ایک عام آدمی کی زندگی سے تعبیر کر کے اُنہیں ڈرامائی حقیقت کا جامہ پہنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ میرے خیال میں اس سے پہلے کی کوئی

کوشش اتنی کامیاب نہیں ہے، جتنی ریوتی کی یہ دو کاوشیں کامیاب ہیں۔ "آگ، راکھ اور روشنی" اور "انسان"! اور ان دونوں میں بھی میں "انسان"، کو سب سے افضل اور ریوتی کے تمام ڈراموں میں سب سے اچھا سمجھتا ہوں یہاں اُس کے ذہنی کی وراثت اور روایت نے سائنس کی بغاوت کو سمو کر اُن نئی حقیقتوں کی طرف اشارہ کیا ہے، جہاں اب انسان کا ذہن پہنچ رہا ہے۔ سب گوشے صاف نہیں ہوتے ہیں۔ ساری تاریکیاں منوّر نہیں ہوئی ہیں۔ لیکن روشنی نظر آتی ہے۔ اور اُجالا بڑھتا اور پھیلتا جا رہا ہے ان دونوں ڈراموں میں ریوتی کا تجزیہ نشتر کی طرح تیز اور پرومیتھس کی طرح جسارت آمیز ہے!

راماداس :۔ "میں صرف آتما کی آواز سنوں گا۔

موہن لال :۔ " راماداس۔ اگر تم عقل کے راستے سے ہٹ کر آتما کے راستے پر جانا چاہتے ہو، تو تمہیں بتانا ہوگا، کہ یہ آتما کیسی ہے، جو عقل کی عدم موجودگی میں انسان کو پاگل اور احمق ہونے سے نہیں بچا سکتی۔ عقل کے گم ہو جانے پر انسان کو ہوش و حواس میں بھی نہیں رکھ سکتی۔

موہن لال :۔ یہی وہ کیلے کا چھلکا ہے، جس پر تم پیر رکھنے سے پھسل گئے۔ یہ درست ہے کہ انسان کے اندر سے عقل کے علاوہ بھی ایک آواز آتی ہے۔ لیکن یہ غلط ہے کہ یہ آواز سچائی اور نیکی کا راستہ دکھاتی ہے۔"

رامداس ۔کیوں، کس لئے ؟

موہن لال ۔ اس لئے کہ یہ آواز سب کے اندر سے ایک جیسی نہیں آتی۔ یہ آواز ایک کو وہ راستہ دکھاتی ہے، جسے ہم صحیح کہتے ہیں۔ دوسرے کو وہ راستہ جسے ہم صریحاً غلط کہتے ہیں۔ یہ آواز ہر انسان، ہر زمانہ، ہر علاقے، اور اکثر ہر موقع کے ساتھ بدلتی رہتی ہے!"

"آگ، راکھ اور روشنی"

اور یہ خدا کے لئے.......

موہن لال ۔ رامداس تم نے اتم غلط خیالات کی گولیاں شاید اندھا دھند کھائی ہیں ۔ تبھی تم ایسی باتیں کر رہے ہو۔ کیا تم اس بھگوان کو بھگوان کہتے ہو، جو اس انتظار میں ہے کہ معصوم مرتے رہیں، مجرم پنپتے رہیں، اور جب اس دنیا میں صرف مجرم ہی رہ جائیں یا تمہارے الفاظ میں پاپ کا گھڑا پوری طرح بھر جائے تب وہ آئے اور اپنے انصاف کی بجلی سے اس بستی کو جلا کر خاک کر دے ؟ رامداس اگر تمہارا بھگوان ایسا ہی ہے، تو وہ اس سپاہی کی طرح گولی سے اڑا دینے کے لائق ہے، جو اس انتظار میں کھڑا رہتا ہے کہ پہلے مجرم جرم کا ارتکاب کر لے، اس کے بعد وہ عمل میں آئے گا!"

(آگ، راکھ اور روشنی)

لیکن یہ تو ہلکی ہلکی، دبی دبی سی جھلکیاں ہیں جو بالآخر ڈرامہ نگار کے تفکر کے منطقی نتیجے کے طور پر "انسان" میں اپنے انجام کو پہنچتی ہیں۔ "انسان"،

اس مجموعے کا بہترین ڈرامہ ہے اور تمثیلی انداز میں لکھا گیا ہے۔ اور اسے اس انداز کے ڈراموں میں بڑی آسانی سے صفِ اوّل میں رکھا جا سکتا ہے۔

"انسان" میں ایک ڈاکٹر مر رہا ہے۔ مرتے وقت اُس کے ذہنی ہیولے میں کائنات کے مختلف مظہر اپنی جبروت کی انتہائی شدت کے ساتھ اُجاگر ہوتے ہیں۔ مرتے ہوئے ڈاکٹر کو جو ایک فلسفی کا ذہن اور موجودہ سائینس کا مکمل ادراک رکھتا ہے، سب سے پہلے وقت ڈراتا ہے۔ پھر مذہب آکے ڈراتا ہے اور آخر میں موت آکے ڈراتی ہے، مگر ڈاکٹر کو اپنے علم کی روشنی میں، عرفان، نروان، سکون، جو کچھ بھی کہیے، نصیب ہو چکا ہے۔ اور وہ ان ہیولوں میں سے کسی سے نہیں ڈرتا اور پُرسکون انداز میں اپنے اختتام کی طرف بڑھتا ہے۔ کیونکہ ڈرامہ نگار کے الفاظ میں:۔

ڈاکٹر۔ "مَیں مر کر بھی نہیں مروں گا۔ ذرا سوچو کہ تمہاری اصطلاح میں مر کر بھی میرا کیا ہوگا؟ یا تو مَیں دفن کیا جاؤں گا یا جلا دیا جاؤں گا۔ قبر میں دب کر میرا جسم خاک بن جائے گا۔ آگ میں جل کر گیس اور راکھ بن جائے گا۔ کھاد اور راکھ سے سبزہ اُگے گا۔ گیس سے بادل بن کر مینہہ برسے گا اور سبزہ کو پروان چڑھائے گا ——— اس طرح مَیں مرنے اور مٹنے کے بجائے تازہ اور مختلف روپوں میں اظہار پا جاؤں گا۔"

(انسان)

اور ——— "مَیں پھر اور پھر پیدا ہوتا رہوں گا اور ہر بار جب

پیدا ہوں گا تو پہلے سے زیادہ جوان اور تابناک ہوں گا۔"

یہ فلسفۂ حیات غنیمت سے کس قدر دور ہے اور کس قدر اُمید افزا ہے۔ یہی جوانی اور توانائی ریوتی سرن شرما کے فن کا اصلی جوہر ہے۔ اگر وہ واقعی ڈرامے کے میدان میں اسی طرح جسارت آمیز تجربے کرتے رہے تو ادبی موت انہیں چھو نہ سکے گی اور اُن کے فن کا حُسن ایلورا کے پتھروں کی طرح زندہ جاوید ہو جائے گا۔

کرشن چندر۔ دلی
۲۴ جنوری ۱۹۶۱ء

کردار

گریش ۔ .. .. ایک نوجوان
سروج .. .. .. گریش کی بیوی
نریش .. .. .. گریش کا دوست

پہلا منظر

(گریش کا ڈرائینگ روم۔ گریش اور اُس کا دوست نریش آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔)

نریش۔ تمہیں یاد ہے، ہم تمہیں کیا کہا کرتے تھے۔ گریش ہے——ڈرٹی مونسٹر (Dirty monstir) اور سچ مچ تم لگتے بھی ایسے ہی تھے—— تمہارا وہ لمبا قد، جھکی کمر، میلی پتلون، بڑھے ہوئے بال اور پالش کو ترستے ہوئے جوتے—— کالج میں ان دنوں تم انسان نظر نہیں آتے تھے۔

گریش۔ (ہنستے ہوئے) چلو خیر—— اب تو تمہیں انسان نظر آتا ہوں۔

نریش۔ انسان ہی نہیں، بلکہ ایک خوبصورت، سجیلا انسان۔ اب تمہارا جسم بھر گیا ہے۔ چہرہ پر خشکی کی جگہ چمک آگئی ہے۔ بال تراشے، سنوارے اور لباس

صاف اور ستھرا نظر آتا ہے۔ لیکن یار یہ انقلاب کیسے آیا؟

گریش۔ تمہاری بھابی کی وجہ سے۔

نریش۔ یقیناً اس کی اور کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ تمہاری ذات سے تو اس خوشگوار انقلاب کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔

گریش۔ ہاں یار نریش۔ شادی کے ایک ڈیڑھ سال تک تو میں سروج کے لئے ایک مسئلہ بنا رہا۔ یوں سمجھو، کہ جہاں سے گزرتا، چیزیں گراتا، پھیلاتا اور بکھیرتا چلا جاتا۔ سروج بیچاری میرے پیچھے پیچھے چیزیں اٹھاتی اور سنوارتی پھرتی۔ صبح کو میں دفتر جاتا تو کمرے کی حالت ایسی ہوتی، جیسے زلزلہ آیا ہو لیکن شام کو لوٹتا، تو ہر چیز قرینے سے لگی پاتا۔ یہی حال میرے کپڑوں کا تھا۔ کبھی ٹخنے بھر پہنے ہی نہ پاتے تھے۔

نریش۔ یوں کہو کہ تقدیر کے سکندر نکلے۔

گریش۔ ہاں یار۔ اس معاملے میں یقیناً تقدیر کو سراہتا ہوں۔ سروج نے میری زندگی میں ایک خوبصورت انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ مجھ پر اور اس گھر کی ہر چیز پر اس کے سلیقے اور سگھڑپن کی گہری چھاپ ہے۔

نریش۔ (فوٹو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) یہ انہیں کی تصویر ہے نا؟

گریش۔ ہاں، اور ساتھ میں میری بچی ہے — کُم کُم۔

نریش۔ گریش تمہیں یاد ہے، تم کہا کرتے تھے تمہیں ایسی خوبصورتی چاہیئے، جس میں سوز کی ہلکی جھلک ہو۔ آبھا نگر جی کو اس لئے پسند کیا کرتے تھے نا؟

گریش۔ ہاں — لیکن یہ اس وقت کیسے یاد آیا؟

نریش۔ اس لئے کہ تمہاری یہ خواہش بھی پوری ہو گئی — بھابی کی آنکھیں دیکھو — کس قدر حسین، کتنی گہری اور کتنی اتھاہ۔ لیکن اُن میں اُداسی کا ایک باسی پھول بھی

پڑا ہے جس نے ان آنکھوں ہی میں نہیں بلکہ سارے چہرے پہ ایک اُداسی اور ایک سوز کی گھلاوٹ پیدا کر دی ہے۔ لگتا ہے ان آنکھوں کے کناروں کو آنسوؤں نے دھو دھو کر پوتر کیا ہے۔

گریش ۔ تم تو شاعری کرنے لگے ؟

نریش ۔ مَیں نے آج تک شاعری نہیں کی گریش۔ یہ اُداس اُداس آنکھیں اور تھکی تھکی پلکیں اپنی گہرائیوں میں اِنسان کی تھکی ہاری آتما کو تھپک کر سچ مچ اس طرح سُلا سکتی ہیں، جیسے ماں اپنے بچے کو۔

گریش ۔ عجب بات ہے کہ تم وہی باتیں کہہ رہے ہو نریش۔ جو مَیں نے محسوس کیا ہے، لیکن جنہیں الفاظ میں ڈھالنے کی کوشش نہیں کی۔ آج مجھے ایک واقعہ یاد آ رہا ہے —— مَیں بیمار ہُوا تھا۔ ایک رات میری حالت بہت خراب ہو گئی۔ ڈاکٹر بھی نااُمید لوٹ گیا۔ سروج میرے سرہانے بیٹھی تھی۔ مَیں نے آنکھیں اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھا۔ اس وقت میری آنکھوں میں خوف بھی تھا اور مایوسی بھی اور حسرت بھی۔ لیکن اسی وقت سروج نے اپنا کپکپایا ہُوا ہاتھ میرے ماتھے پر رکھ دیا اور اپنی پلکیں کچھ ایسے بند کر لیں جیسے اس نے مجھے اپنی پلکوں میں چھپا کر رکھ لیا ہو، اور نریش، مَیں ایسے سو گیا، جیسے کوئی تھکا ہارا بچہ سو جاتا ہے۔

(باہر ٹیکسی کے رُکنے کی آواز اور ہارن سُنائی دیتا ہے)

لو سروج ڈاکٹر کے ہاں سے لوٹ آئی۔

(سروج ڈرائینگ رُوم میں داخل ہوتی ہے)

گریش ۔ (تعارف کراتے ہوئے) سروج —— میرے دوست نریش :

سروج ۔ اوہ آپ آ گئے —— نمستے۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ مَیں آپ کے سواگت

کے لئے گھر نہ رہ سکی۔ مجھے آپ کے آنے کی خبر تھی۔ لیکن بچی اچانک بیمار ہو گئی۔
اور اُسے لے کر مجبوراً ڈاکٹر کے یہاں ..... !

نرلیش۔ ایسی کوئی بات نہیں بھابی جی —— آپ یہاں نہیں تھیں، لیکن یہاں کی
ہر چیز سے آپ کی موجودگی کا احساس ہوتا تھا۔ بچی کہاں ہے ؟

سروج۔ نوکرانی پچھلی طرف سے اندر لے گئی ہے —— ابھی بھیجتی ہوں اُسے۔ آپ
اس وقت چائے پئیں گے یا کوئی ٹھنڈی چیز ؟

گرلیش۔ کوئی چیز بھجوا دیجئے —— مَیں چائے کے فوراً بعد لسی اور لسی کے فوراً
بعد دُودھ پی لیتا ہوں۔

سروج۔ (متفکر ہو کر) نہیں نہیں۔ ایسا نہ کیا کیجئے۔ کبھی کبھی جسم ہماری لاپرواہیوں کو
برداشت نہیں کر سکتا۔ اچھا مَیں ابھی چائے لاتی ہوں۔

(اندر چلی جاتی ہے)

نرلیش۔ گرلیش، مَیں سچ کہتا ہوں، تم بے حد خوش نصیب ہو۔

گرلیش۔ اپنے مُنہ سے ہاں کرنا بُرا لگتا ہے نرلیش۔ لیکن ہاں کہے بغیر رہا بھی نہیں
جاتا (یکایک سنجیدگی دُور کرتے ہوئے اور موضوع بدلتے ہوئے) اچھا ان
باتوں کو چھوڑو۔ یہ تو بتاؤ، کالج کے ساتھی کیسے ہیں؟ مَیں تو سب سے
الگ ہو گیا ہوں۔

نرلیش۔ ارے سب اچھے ہیں —— یہاں تک کہ تم جیسے گاؤدی بھی۔

گرلیش۔ (ہنستے ہوئے) اچھا اچھا۔ یہ تو بتاؤ شیام سُندر کہاں ہے ؟

نرلیش۔ وہ پچھلے دنوں گورکھ پور میں ڈپٹی کلکٹر تھا۔

گرلیش۔ بہت آگے نکل گیا ؟

نرلیش۔ ہاں مقدر کا سکندر نکلا۔ یہ تو تمہیں معلوم ہی ہوگا کہ نارائن ایکٹر بن گیا؟

گریش۔ ہاں ــــــ میں بمبئی میں اس سے ملا بھی تھا۔ ٹھاٹ ہیں سالے کے یار اُسے
شروع ہی سے شوق تھا ایکٹنگ کا۔
نریش۔ چلو اُسے تو شروع سے شوق تھا۔ مگر اس حسنی کو کس بات کا شوق تھا ہ آج
کل ایک اخبار کا ایڈیٹر بنا ہوا ہے۔
گریش۔ (تعجب سے) حسنی اور ایڈیٹر؟ اسے تو کن میلیا ہونا چاہیئے تھا۔ مگر اس لحاظ
سے تو اپنے سب ساتھی زندگی میں اپنے اپنے مقام پر پہنچ گئے ہیں۔
نریش۔ ہاں (گہرا سانس لے کر) سب زندگی میں کامیاب ہو گئے لیکن بے چارہ ونود۔!
گریش:۔ ونود؟ ــــــ وہ تمہارا دوست؟ اُسے کیا ہوا؟
نریش۔ اُس نے خودکشی کر لی۔
گریش۔ (حیرت سے) خودکشی؟
نریش:۔ ہاں ــــ بڑی دردناک موت تھی۔
گریش۔ اوہ ــــ مجھے معلوم نہیں، کیونکہ جس سال وہ ہمارے ہوسٹل میں آیا، میں
کالج چھوڑ کر چلا گیا تھا، لیکن تم نے ایک بار ذکر کیا تھا، کہ وہ کوئی ریسرچ کر رہا
تھا۔
نریش۔ اس نے اپنا تھیسس مکمل بھی کر لیا تھا۔ مگر موت اسکی تاک میں تھی۔
گریش۔ کیا ہوا؟
نریش۔ کیا بتاؤں ــــ کمبخت نے مجھے بھی اس وقت بتایا جب پانی سر سے گزر چکا تھا۔
گریش۔ کیا محبت؟
نریش۔ ہاں ــــ اور اس محبت نے اس کی جان لے ڈالی۔
گریش۔ لیکن وہ تو بہت سیدھا سادہ لڑکا نظر آتا تھا۔
نریش۔ اسی لیئے تو اپنی جان تک دے بیٹھا۔ وہ جتنا سیدھا تھا، اتنا ہی جذباتی

تھا۔ خاموش رہتا تھا، اس لیے محسوس بہت کرتا تھا۔ معمولی سی بات بھی اس کے لیے پہاڑ بن جاتی تھی۔ اور اس پہاڑ پر بیٹھ کر تفکرات میں اس طرح گم ہو جاتا تھا۔ جیسے چاروں طرف سیلاب اُمڈ رہا ہے، اور وہ دُنیا میں اکیلا ہے۔

گریش ۔ مگر یہ ہُوا کس طرح ؟

نریش ۔ یار کالج کے زمانے میں اُسے ایک لڑکی سے محبت ہو گئی ۔ لڑکی کسی بہت بڑے گھرانے کی تھی۔ اس نے لڑکی کے باپ تک رشتے کی بات پہنچائی۔ لیکن اس نے رشتہ ٹھکرا دیا —— ونود کو کسی مندر کے پجاری نے پالا تھا نا۔ اس کے بعد دونوں نے گھر سے بھاگنے کی سکیم بنائی۔ لیکن رات کو جس وقت لڑکی اپنے گھر سے نکل رہی تھی، اس کے والد نے آ کر پکڑ لیا۔ ونود نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا، اور اُسے اتنا صدمہ پہنچا، کہ پاگل نے لیبارٹری سے سائنائیڈ نکال کر چاٹ لیا۔

گریش ۔ اوہ —— کیا دردناک انجام ہے —— لیکن اس لڑکی کا کیا ہُوا ؟

نریش ۔ ہُوا کیا ہوگا —— ماں باپ نے کہیں شادی کر دی ہو گی ۔

گریش ۔ لیکن وہ تو جیتے جی مر گئی ہو گی ! وہ خوش تھوڑا ہی رہ سکی ہو گی۔

نریش ۔ ہاں —— کلیجہ مسوس کر جی رہی ہو گی ۔

(سروج پچھلے دروازے سے ڈرائینگ رُوم میں داخل ہوتی ہے۔ ہاتھ میں چائے کی ٹرے ہے)

سروج ۔ لیجئے چائے لیجئے۔

نریش ۔ اوہ

سروج ۔ آپ دونوں کیسے ہو رہے ہیں ؟

گریش ۔ کچھ نہیں ۔ نریش نے اپنے ایک دوست کی کہانی سنائی ۔ بے چارے نے خودکشی کر لی ۔

سروج ۔ (چیخ کر) خودکشی ؟

(اور ایک ساتھ سروج کا سارا جسم لرز اٹھتا ہے ۔ ٹرے اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر پڑتی ہے ، اور وہ خوفزدہ ہو کر بُری طرح ہانپنے لگتی ہے ۔ گریش اور نریش اُٹھ کر اُسے سہارا دیتے ہیں ۔)

گریش ۔ کیا ہوا سروج ؟

نریش ۔ آپ کو کیا ہوا بھابی جی ؟

گریش ۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے سروج ؟

سروج ۔ (اپنے آپ کو سنبھال کر) ہاں ..... ہاں ..... مَیں ٹھیک ہوں ——— بس مجھے کسی کی خودکشی کی بات ......

نریش ۔ آپ اس وقت آرام کیجئے بھابی جی ——— وہ تو میرا دوست تھا ۔ ان کا نہیں ۔

گریش ۔ تم اندر چلو سروج ——— مَیں تمہیں سہارا دیتا ہوں ۔

سروج ۔ نہیں نہیں ۔ مَیں خود چلی جاؤں گی ۔ آپ مجھے معاف کریں .....

نریش ۔ کیسی بات کرتی ہیں آپ ۔ گریش کو ایسی بُری بات کا ذکر آپ کے سامنے کرنا ہی نہیں چاہیئے تھا ۔ آپ اندر جائیں ۔

گریش ۔ تم اندر بغل والے کمرے میں جا کر کپڑے بدل لو نریش ۔ مَیں ابھی آتا ہوں ۔

نریش ۔ ہاں ، ہاں ——— تم جاؤ ۔

(گریش اور سروج اندر چلے جاتے ہیں ۔ نریش جھک کر پاس رکھا ہوا سوٹ کیس اُٹھاتا ہے ۔ اور بغل والے کمرے میں چلا جاتا ہے)

دُوسرا منظر

(گریش کا وہی ڈرائینگ روم، صوفے پر گریش اور سروج بیٹھے ہیں ——— سروج کپڑے پر ایک پھول نکال رہی ہے)

سروج ۔ آپ کے دوست نریش ابھی تک نہیں آئے؟

گریش ۔ آجائے گا ——— اس کے دُور کے رشتہ دار یہاں رہتے ہیں، اُن سے ملنے گیا ہے۔

سروج ۔ پھر بھی بہت دیر ہو گئی ۔ اندھیرا ہو چلا ہے، اُنہیں اب تک آجانا چاہیئے تھا۔

گریش ۔ تم بہت جلدی گھبرا جاتی ہو۔ وہ اس شہر میں نیا تھوڑا ہی ہے۔ آجائے گا۔

سروج ۔ (کچھ لمحے خاموش ہو کر) پُرانے دوستوں سے مل کر بہت خوشی ہوتی ہے نا؟

گریش ۔ ہاں ——— اور خاص طور پر اُس وقت جب وہ پہلے جیسے خلوص اور محبّت سے ملتے ہیں۔ نریش کے دل میں میرے لئے پہلے جیسی محبت ہے۔ اور سب سے بڑی خوشی کی بات یہ ہے، کہ وہ تمہیں بھی پسند کرتا ہے۔ کل تمہاری بے حد تعریف کر رہا تھا۔

سروج ۔ میری؟ بھلا مجھ میں کیا ہے!

گریش ۔ تم میں کیا ہے، مَیں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا سروج۔ لیکن اِتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ تمہیں پانے کے بعد مجھے کسی اور چیز کو پانے کی چاہ نہیں رہی۔ اِنسان کچھ سپنے دیکھتا ہے، کچھ چیزوں کا تصوّر کرتا ہے۔ اس کی آتما کسی کے پیار کے لئے بھٹکتی پھرتی ہے۔ مَیں نے تمہیں پا کر سب کچھ پا لیا ہے۔

سروج ۔ بس بس، اور زیادہ نہ کہو (یکایک اُداس ہو جاتی ہے) مَیں اتنی اچھی نہیں ہوں۔ یہ تمہارا پیار ہے، جو مَیں تمہیں ایسی دکھائی دیتی ہوں۔

گریش۔ ارے تم پھر اُداس ہوگئیں ؟ سروج کیا بات ہے کہ جب کبھی میں اپنے دل کی بات تم پر کھولنے لگتا ہوں، اپنا پیار جتانے لگتا ہوں، تم اُداس ہوجاتی ہو۔ تمہاری پلکیں بند ہوجاتی ہیں، اور ان سے آنسو ٹپکنے لگتے ہیں۔ تم تو اپنے پیار مجھ پر جتا لیتی ہو ـــــ میری ذرا ذرا سی بات کا خیال کر کے، میری ہر تمنا پوری کر کے، لیکن جب کبھی میں اپنے جذبات کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ تم مجھے روک دیتی ہو۔ میں ترستا رہ جاتا ہوں۔

سروج۔ لیکن مجھے تو معلوم ہے کہ آپ مجھے کتنا چاہتے ہیں۔ مجھے یہ سب کچھ سُننے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

گریش۔ سچ ؟

سروج۔ ہوں۔

گریش۔ سروج میری زندگی تمہاری زندگی میں کچھ اس طرح گتھ گئی ہے کہ تمہارے بغیر میں جی نہیں سکتا۔ نریش نے اپنے ایک دوست کی کہانی سُنائی تھی جس نے محبت میں ناکام ہو کر خودکشی کر لی۔ تمہیں پانے سے پہلے شائد میں اس کے اس قدم کو جنون قرار دیتا لیکن اب میں محسوس کر سکتا ہوں کہ جسے ہم پیار کرتے ہیں، اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔

سروج۔ (بہت سنبھل کر) نریش جی کے کسی دوست نے خودکشی کر لی تھی ؟

گریش۔ ہاں ـــــ وہ بے حد حساس تھا۔ محبت میں ناکامی برداشت نہ کر سکا لیکن مجھے یہ ذکر تم سے نہیں کرنا چاہیئے۔ تم تو ویسے ہی اُداس رہتی ہو۔

(نریش جلدی جلدی قدم اُٹھاتا ہوا کمرے میں داخل ہوتا ہے)۔

نریش۔ بھئی آپ لوگ مجھے معاف کیجئے گا، کافی دیر ہوگئی۔ بھابی جی۔ آپ بس جلدی سے تیار ہو جائیے گا ـــــ سینما جانا ہے۔

گریش۔ سینما؟

نریش۔ ہاں یار۔ بہت اچھی فلم ہے۔ اور اس کا آخری شو ہے۔ جلدی تیار ہو جائیے بھابی ہمیں ٹکٹ لے آیا ہوں۔

سروج۔ لیکن میں......!

گریش۔ نریش یہ تو نہیں جا سکیں گی: بچی کی طبیعت خراب ہے اور آیا رات بھر کی چھٹی لے کر چلی گئی ہے۔

نریش۔ ارے۔

سروج۔ مگر کوئی بات نہیں۔ یہ آپ کے ساتھ چلے جائیں گے۔

گریش۔ لیکن تم؟..... اکیلی......!

سروج۔ تو کیا ڈر ہے؟ کواڑ بند کر لوں گی۔ آپ اُن کے ساتھ ضرور جائیے۔ بے چارے ٹکٹ خرید لائے ہیں۔

نریش۔ بھابی ـــــ سچ اگر مجھے کُم کُم کی بیماری کا خیال ہوتا۔ تو ہرگز ٹکٹ نہ لاتا۔

سروج۔ تو کیا ہُوا ـــــ آپ اُٹھیئے نا۔

گریش۔ اچھا ـــــ لیکن ہم ایک بجے کے قریب لوٹیں گے۔

سروج۔ کوئی بات نہیں۔ آپ بے فکر ہو کر جائیے۔

گریش۔ آؤ نریش۔

نریش۔ چلو۔ اچھا بھابی۔

سروج۔ آپ جائیے ـــــ دیر نہ ہو جائے۔

(دونوں باہر نکل جاتے ہیں۔ سروج اُٹھ کر اندر چلی جاتی ہے)

(پردہ)

تیسرا منظر

(وہی ڈرائینگ روم ۔ گرلیش اور نرلیش شب خوابی کے کپڑے پہنے صبح کی چائے پی رہے ہیں۔)

نرلیش ۔ کیوں؟ رات والی تصویر تھی نا ، غضب کی ؟

گرلیش ۔ ہاں یار ——— بڑی دردناک تصویر تھی ۔ اب تک اثر باقی ہے ۔

نرلیش ۔ عورت کی ٹریجڈی کیا خوب پیش کی تھی ۔

گرلیش ۔ ہاں ——— اور دوست نہ جانے کیوں تصویر دیکھتے ہوئے مجھے کئی بار ونود کی محبوبہ یاد آگئی ۔ میں ونود یا اس کی محبوبہ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا لیکن کیا ونود کی موت کے بعد ونود کی محبوبہ اس جذباتی کرب اور ذہنی کشمکش سے نہ گذری ہوگی ، جس سے رات والی فلم کی ہیروئن گذری ۔ اس پر کیا بیتی ہوگی ، جب اس کی شادی ہوئی ہوگی ؟ کس طرح محبت کر سکی ہوگی وہ اپنے شوہر سے

نرلیش کیا نہیں کچھ نہیں معلوم ، اس لڑکی پر کیا گذری ؟

نرلیش ۔ نہیں ——— دراصل میں نے تو اسے دیکھا بھی نہیں ۔ شائد میں اس سے ملنے کی کوشش کرتا لیکن امتحان ختم ہو گئے ، اور میں لکھنؤ سے چلا آیا لیکن خواہش ضرور ہے کہ زندگی میں ایک بار اس سے ملوں اور اس کی امانت اُسے لوٹا دوں ۔

گرلیش ۔ امانت ؟

نرلیش ۔ ہاں ——— میرے پاس اس کے وہ خطوط محفوظ ہیں ، جو اس نے ونود کو لکھے تھے ۔ ونود آخری دنوں میں میرے ساتھ ہی رہنے لگا تھا ۔ غریب کے ٹرنک میں کنڈا بھی نہیں تھا ۔ اپنے روپے اور خط میرے ہی پاس رکھتا تھا ۔

گریش۔ نریش! نہ جانے کیوں مَیں اس لڑکی کے بارے میں جذباتی ہوا جا رہا ہوں ——
شاید۔ یہ قلم کا اثر ہو۔ لیکن اس لڑکی کے بارے میں معلوم تو کرو —— مَیں
اس معاملہ میں تمہاری مدد کروں گا۔ کیونکہ سروج لکھنؤ ہی کی ہے۔

نریش۔ لیکن معلوم کرکے ہوگا کیا؟ اور پھر مجھے تو اس کا اصلی نام بھی معلوم نہیں۔

گریش۔ اصلی نام؟

نریش۔ ہاں —— تو تو نے اُسے "دیپ شِکھا" کا نام دے رکھا تھا۔ اور خطوں
میں بھی وہ اپنے کو دیپ شِکھا لکھا کرتی تھی —— اور اگر اس کا اصلی نام،
پتہ معلوم بھی ہو جائے تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟

گریش۔ نریش کیا تم نہیں سمجھتے کہ اُسے ہمدردی کے دو الفاظ کی کتنی سخت ضرورت ہوگی؟
کسی غمگسار کے ملنے سے اس کی رُوح کو کتنا قرار آئے گا۔ کیا ہم اس کا غم
ہلکا نہیں کر سکتے؟

نریش۔ گریش، زندگی میں اتنا غم اور درد ہے کہ اُسے تم بانٹ نہ سکو گے۔ یہ تو ایک
دیپ شِکھا ہے۔ زندگی میں نہ جانے کہاں اور کتنی تعداد میں دیپ شِکھائیں
جل رہی ہیں، اور جل چکی ہوں گی۔ وہ دیپ شِکھا جہاں بھی جل کر ختم ہو رہی
ہے، اُسے ختم ہونے دو۔ ہمدردی سے تم اُسے سکون نہ بخش سکو گے۔ اُلٹا
بھڑکا دو گے۔

گریش۔ نہیں نریش —— مَیں وعدہ کرتا ہوں، مَیں خود اس سے کبھی نہ ملوں گا۔ مَیں سروج سے
کہوں گا۔ شاید وہ اس کی آتما کا بوجھ ہلکا کر سکے۔ عورتوں کی اس بدنصیبی اور مجبوری
پر میرا دل خون روتا ہے۔

نریش۔ دیکھو گریش، تمہیں بھابی سے اس کا ذکر نہ کرنا چاہیئے۔ دیکھا نہیں تھا۔ خودکشی
کی بات سنتے ہی ان کے دل پر ٹھیس لگی تھی۔ ہاں، اگر مَیں کبھی لکھنؤ گیا تو پتہ

ؔ دیپ شِکھا یعنی دیئے کی لَو

لگانے کی کوشش کروں گا۔
گریش ۔ مگر وہ رہتی کہاں تھی؟
نریش ۔ حضرت گنج میں ۔
گریش ۔ (دلچسپی سے) حضرت گنج میں؟ اس کے والد کا کیا نام تھا؟
نریش ۔ یہ مجھے معلوم نہیں۔ بس اتنا یاد پڑتا ہے وہ تو انہیں لکھنؤ کا بہت بڑا بیوپاری بتاتا تھا ——— شائد کاغذ کا۔
(گریش چونک اُٹھتا ہے، لیکن نریش کو اسکی خبر نہیں ہوتی - وہ سگریٹ کے دھوئیں میں ادھ مندی آنکھوں سے خلا کو گھورتا رہتا ہے۔)
گریش ۔ کیا کہتے ہو؟
نریش ۔ ہاں، ہاں۔ کاغذ کے بڑے بیوپاری کاکافی ہاؤس کے برابر اُن کی دکان تھی۔
گریش ۔ (بیٹھے بیٹھے اُٹھ کھڑا ہوتا ہے، اور سوکھے گلے سے بول اُٹھتا ہے) سُرج۔
نریش ۔ (چونک کر کچھ نہ سمجھتے ہوئے) سروج؟ بھابی؟ کہاں ہیں؟ (مڑ کر دیکھتا ہے عین اس وقت سُرج دروازے سے کمرے میں داخل ہوتی ہے) آیئے آیئے بھابی جی۔
سُرج آپ نے چائے پی لی؟ ارے آپ کو کیا ہوگیا ہے؟
گریش ۔ (سوکھے گلے سے، نظریں بچاتے ہوئے) کچھ نہیں ..... کچھ نہیں۔
سُرج ۔ کیا سر میں درد ہے؟
نریش ۔ ابھی تو تم ٹھیک تھے، یکایک کیا ہوگیا؟ چہرہ سفید ہو رہا ہے۔
گریش ۔ کچھ نہیں ..... کچھ نہیں۔ میرے سر میں درد ہے۔ میں اندر جاکر سوؤں گا۔
سُرج ۔ آیئے، میں بستر بچھا دوں۔
گریش ۔ نہیں۔ میں خود بچھاؤں گا۔ تم یہیں ٹھہرو ——— نریش کے پاس۔

نریش ۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے ؟ ابھی تو تم ٹھیک تھے ۔

گریش ۔ بس ۔۔۔ میں آرام کرنا چاہتا ہوں ۔

نریش اے تم اب بھی وہی ہو ۔ تمہاری بے ہودگی گئی نہیں ۔

گریش ۔ (بڑی تلخی سے) ہاں گئی نہیں ۔ میں بے ہودہ ہی نہیں ، احمق اور دماغی ہوں ۔

نریش ۔ (مجروح ہو کر) گریش ! تم سنجیدہ ہو گئے ؟ مجھے معاف کر دو ۔ میرا مُدعا تمہاری ہتک کرنا نہیں تھا ۔

سروج ۔ یہ آپ نے انہیں کیا کہہ دیا ؟ انہوں نے تو مذاق کیا تھا ۔

گریش ۔ (اسی تلخی سے) ادمذاق کرنے اور بے وقوف بنانے کے لئے دُنیا میں ایک میں ہی رہ گیا ہوں ؟

نریش ۔ گریش ! میں ایک دفعہ پھر تم سے معافی مانگتا ہوں ۔ شائد تمہیں میرا یہاں رہنا پسند نہیں آیا ۔

گریش ۔ (پلٹ کر) نہیں نہیں نریش ۔ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے ۔ تم مجھے معاف کر دو کیونکہ میں ہوش میں نہیں ہوں ۔ پاگل ہو گیا ہوں ۔

(منہ چھپا کر اندر چلا جاتا ہے ۔ نریش اور سروج اس کے پیچھے پیچھے اندر جاتے ہیں ۔)

"پردہ"

چوتھا منظر

(وہی ڈرائینگ رُوم ، کیلنڈر سولہ تاریخ دکھا رہا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہفتہ گزر گیا ہے ۔ گریش ہاتھ میں ایک پیکٹ لئے ہوئے پگھلایا سا کمرے میں داخل ہوتا ہے ۔ اِدھر اُدھر دیکھتا ہے ، اور یہ یقین کر کے کہ

کمرے میں کوئی نہیں ہے.............. وہ کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیتا ہے۔ پھر بتی جلا کر اور جلدی میں کوٹ اُتار کر صوفے پہ پھینک کر بیٹھ جاتا ہے اور کانپتے ہاتھوں سے پیکٹ کی ڈوریاں توڑتا ہے۔ ڈوریاں توڑ کر جیسے ہی کاغذ اُتارتا ہے۔ بہت سے خط میز پہ بکھر جاتے ہیں۔ بوکھلا کر وہ خطوں کو سمیٹنے کی کوشش کرتا ہے اور پھر ایک خط لفافے سے نکال کر اس پر نظر ڈالتا ہے۔ وہ یکایک اس طرح چونک پڑتا ہے، جیسے سانپ نے ڈس لیا ہو)

گریش۔ اوہ ——— تو تم ہی ہو ——— جو سوچا تھا۔ صحیح نکلا۔ ونود کی محبوبہ دیپ شِکھا تم ہی ہو ——— تم، سروج ——— ہاں یہ نرتیش کے بھیجے ہوئے خط تمہارے ہی ہاتھ کے لکھے ہیں ——— خط جو تم نے ونود کو لکھے ——— اوہ میں ان خطوں کے ایک ایک حرف کو پہچانتا ہوں، کیونکہ ایسے ہی حروف تم نے مجھے بھی لکھے ہیں اور میں نے ان حرفوں کو لاکھ لاکھ بار پڑھا ہے، پوجا ہے، آنکھوں سے لگایا ہے ——— یہ سمجھ کر کہ یہ موتی تم نے اپنی آتما کی گہرائی سے پہلی بار میرے لئے، صرف میرے لئے نکالے ہیں . . . . لیکن اب معلوم ہوا، یہ موتی پاک نہیں ہیں۔ یہ موتی اُترے ہوئے ہیں۔ یہ وہ پھول ہیں، جو تم نے ونود کی لاش سے اُٹھا کر مجھ پر چڑھائے ——— اوہ، جسے میں آرتی کا دیپک سمجھا، وہ سمادھی کا دِیا نکلا۔ میں چار سال سے اپنے گھر میں سمادھی کا دِیا جلائے ہوئے ہوں ——— تم نے یہ ٹھیک ہی لکھا ہے۔ (پڑھتا ہے۔ اگر سروج کی آواز میں پڑھا لئے جائیں تو بہت مؤثر ہوگا) "ونود اگر تم مجھے نہ ملے، تو یہ ہونٹ ہنسنا چھوڑ دیں گے۔ یہ پلکیں لجانا چھوڑ دیں گی۔ میری چھاتی میں یہ ننھا سا دل کس کی آہٹ سے دیئے کی لو کی طرح جھپٹنا بند کر دے گا ———" اوہ، تو یہ ہے تمہاری

اُداسی کا سبب۔ یہ ہے وہ اُداسی کا پھول جو نرگش کو تمہاری آنکھوں میں پڑا نظر آیا —— سروج، اب معلوم ہوا کہ جس گرمی اور جس تڑپ کو میں تم میں اور تمہارے خطوں میں تلاش کرتا رہا، وہ تم کسی اور پر لُٹا چکی ہو —— (پھر خط پڑھنے لگتا ہے) تو تو ابھی ابھی گھڑی نے دو بجائے ہیں۔ سب سو گئے ہیں۔ چاندنی بھی پیڑوں کی بانہوں پر جھولا جھول کر سو گئی ہے —— صرف میں جاگ رہا ہوں۔ میرے اپنے چاند، تم کہاں ہو؟ کل تین دن بعد تمہیں اپنی کھڑکی کے سامنے سڑک پر دیکھا تھا —— ہائے تمہاری کیا حالت ہو گئی ہے —— میرے چاند کو گہن لگ گیا۔ ہاں گہن لگ گیا۔ سب چیزوں کو، چاند کو، سورج کو، آسمان کے تاروں کو، اور زمین کے ذرّوں کو۔ —— میری زندگی اس مہیب گہن کے سایے میں آگئی ہے —— (تھکے لہجے میں) میں گہنا گیا ہوں۔

(روشنی بجھ جاتی ہے۔ پردہ گرجاتا ہے)

پانچواں منظر

(وہی ڈرائنگ روم۔ سروج میز کی کتابوں کو ٹھیک کر کے گلدان کے پھولوں کو سجاتی ہے۔ عین اُسی وقت گرِیش کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ اس کے چہرے پر وحشت سی برس رہی ہے —— بظاہر وہ نارمل معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس کے برتاؤ میں ایک غیر فطری پن ہے۔ جو اس کے ذہن کی غیر معمولی حالت کا پتہ دیتا ہے۔ وہ داخل ہوتا ہے۔ تو بہت سے ڈبے بغل میں دبائے ہوتا ہے)

سروج ۔ (خوش ہو کر) آپ آگئے۔

گرِیش ۔ ہاں۔

سروج۔ یہ کیا لائے؟

گریش۔ تمہارے لئے ساڑیاں۔

سروج۔ میرے لئے ساڑیاں، لیکن ابھی پرسوں تو آپ دو ساڑیاں لائے تھے۔

گریش۔ تو کیا ہوا (ڈبہ کھولتا ہے) دیکھو یہ رہی ساڑیاں۔

سروج۔ (چونک کر) لیکن یہ بھی بڑے شوخ رنگ کی ہیں۔

گریش۔ تو کیا ہوا؟

سروج۔ میں نے آپ سے کہا تھا، مجھے شوخ رنگ اچھے نہیں لگتے۔

گریش۔ کیوں اچھے نہیں لگتے؟

سروج۔ (اداسی سے) میرے رنگ پر نہیں کھلتے۔

گریش۔ یہ بھی ایک ہی کہی۔ کہ تمہارے سفید رنگ پر شوخ رنگ نہیں کھلیں گے۔ اب میں تمہیں یہ ہلکے رنگ کی ساڑیاں پہننے نہیں دوں گا —— (دوسرا پیکٹ سامنے رکھتے ہوئے) اور یہ رہا تمہارے میک اپ کا سامان۔

سروج۔ میک اپ کا؟ یہ آپکو کیا ہوگیا ہے؟ آپ تو جانتے ہیں کہ میں پاؤڈر تک نہیں لگاتی۔

گریش۔ اسی لئے تو سب کچھ لایا ہوں (لہجہ میں غیر دانستہ طور پر بے رحمی اور سختی جھلکنے لگتی ہے) اب تم شوخ رنگ کے کپڑے پہنو گی، اور میک اپ کرو گی۔ میں اب تمہیں ہرگز اداس اور غمگین نہیں رہنے دوں گا۔ تمہیں ہنسنا ہوگا۔ کھلکھلانا ہوگا۔ سمارٹ بننا ہوگا۔ کلب جانا ہوگا۔

سروج۔ ان دو تین دنوں میں آپ کو سچ مچ کچھ ہوگیا ہے؟ ہم تو اب تک اپنی سادہ زندگی میں خوش تھے۔ آپ خود کہتے تھے، زندگی میں برساتی ندی جیسا اُتھلا پن چھچھورپن کی نشانی ہے —— اور ہمارے بچی بھی ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے ہمیں عیش کرنا اور ایسی ویسی جگہ جانا زیب نہیں دیتا۔

گریش ۔ واہ، یہ بھی آپ کی بھی ایک ہی کہی۔ کیا جن کے ایک بچی ہو جاتی ہے، وہ کپڑے پہننا اور فیشن کرنا بند کر دیتے ہیں؟ تم خواہ مخواہ بڑھیا بن کر رہ گئی ہو۔ ہر وقت سر ڈھانپے اور نظریں جھکائے اور ہونٹ بھینچے رہتی ہو۔ (ڈرامائی انداز میں بولنے لگتا ہے، جس میں بناوٹ کے ساتھ کھسیانا پن بھی عیاں ہے) ارے ذرا سر کو ہوا لگنے دو۔ ان لانبے لانبے بالوں میں گلاب کے پھولوں کو مسکرانے دو۔ پلکیں اٹھاؤ اور زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھو۔

سروج ۔ آج آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ آپ نے تو کبھی پہلے ایسی باتیں نہ کی تھیں۔ آپ مذاق تو ......

گریش ۔ نہیں مذاق نہیں کر رہا، پوری سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔ اب تمہیں سوسائٹی کی دوسری عورتوں کی طرح رہنا ہوگا۔ نہیں تمہارے بال بھی ترشوا کر.....

سروج ۔ نہیں، نہیں ــــــ یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔ ایسا میں کبھی نہ ہونے دوں گی۔

گریش ۔ (تیزی سے) کیوں؟ وجہ؟

سروج ۔ (لہجہ فوراً مدھم پڑ جاتا ہے، اداسی گہری ہو جاتی ہے) بس.... بس مجھے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگتا۔

گریش ۔ کیا اچھا نہیں لگتا؟ ــــ میں؟ ــــ یہ گھر؟

سروج ۔ (تڑپ کر) یہ..... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔

گریش ۔ تو پھر تم یہ سب کچھ کیوں نہ کرو گی؟ تمہیں کرنا ہوگا۔

سروج ۔ نہیں یہ سب کچھ نہ کر سکوں گی۔ (آنسو چھلک پڑتے ہیں، پلّو میں منہ دے لیتی ہے)

گریش ۔ (ڈھٹے پن سے) کیونکہ تم سوگ منا رہی ہو؟

سروج ۔ (تڑپ کر) کیا....... یہ ...... یہ آپ نے کیا کہہ دیا۔

گریش ۔ ڈر کیوں گئیں، مَیں نے تو اپنے کو گالی دی ہے ــــ کچھ اور نہیں کہا ہے۔ ابھی مَیں زندہ ہوں۔ شوخ رنگ کی ساڑی پہننے پر، میک اپ کرنے اور بال 'باب' کرانے پر کوئی نہ ٹوکے گا۔ ہاں اگر میرے ہوتے ہوئے بھی تم اپنے کو بیوہ .....

سروج ۔ (اُٹھ کر ہاتھ پکڑ لیتی ہے) بس بس، بھگوان کے لئے آگے ایک لفظ نہ کہئے۔ مجھے اتنی سخت سزا نہ دو۔ آپ جو کہیں گے، مَیں خوشی سے کروں گی۔

(اور روتی ہوئی اُٹھ کر تیزی سے اندر چلی جاتی ہے ــــ گریش ایک لمحہ تو اُسی حالت میں بیٹھا رہتا ہے۔ پھر اس کے چہرے پہ گہری روحانی تکلیف اور ذہنی کشمکش کے آثار نمایاں ہوتے ہیں۔ وہ کوٹ اُتار کر پھینک دیتا ہے۔ ٹائی کی گرہ ڈھیلی کر دیتا ہے۔ کمرے میں بے چینی سے گھومتا ہے اور آخر صوفے پہ گر کر اور میز پہ بانہیں رکھ کر اپنا سر بانہوں میں چھپا لیتا ہے۔ جب وہ سر اُٹھاتا ہے تو اُس کے چہرے پہ وحشت نمایاں ہوتی ہے اور وہ تڑپ کر)

گریش ۔ اوہ، یہ سب کچھ کیا ہے؟ ..... کیا ہے۔ کیا ہو رہا ہے ..... مَیں کیا کر رہا ہوں ..... مجھے کیوں لگتا ہے، جیسے کوئی اصلی سورج اُٹھا کر لے گیا ہے۔ اور ساری دنیا میں ایک بڑا سا نقلی سورج چمک رہا ہے۔ دھوپ کا رنگ بدل گیا ہے۔ یہ مکان، یہ فرنیچر، یہ تصویریں، سب گھناؤنی ہوئی کیوں معلوم ہوتی ہیں؟ ..... سروج یہ سب کچھ کیا ہے؟ یہ چار سال جو تم نے میرے ساتھ گزارے ہیں۔ یہ خدمت جو تم نے میری کی ہے، یہ میرا گھر جو تم نے سجایا ہے۔ یہ بچّی جو تم نے مجھے دی ہے۔ یہ سب کچھ کیا ہے؟ مجھے کیوں لگتا ہے، جیسے یہ آسمان، زمین، چاند، ستارے، سب موم کے بنے ہیں اور اب موم پگھل رہا ہے اور مَیں ــــ اِن موم کے پگھلتے ہوئے تودوں کو پکڑنے کے لئے بھاگا بھاگا

پھر رہا ہوں ...... سروج تم کیا ہو؟ ...... تم اپنا سارا پیار، ساری محبت
ایک اور آدمی پر لٹا چکی ہو، لیکن پھر بھی مجھے سب کچھ دیئے جا رہی ہو ——
یہ کیا ہے کہ آج بھی صبح جب میری آنکھ کھلتی ہے تو تم میرے سامنے چائے
لئے کھڑی ہوتی ہو؟ غسل خانے میں میرا تولیہ اور میرے کپڑے مجھے ٹنگے ہوئے
ملتے ہیں۔ دفتر سے لوٹنے پر مجھے اپنے چپل اور کپڑے اِس طرح رکھے ملتے
ہیں۔ جیسے تم اِنتظار میں ہو کہ مَیں آؤں اور اُنہیں پہن لوں —— سروج کیا
یہ سب کچھ دھوکا ہے؟ یا پھر دھوکا، دھوکا نہیں ہوتا۔ سچائی سچائی نہیں
ہوتی —— ونود کی یاد کو تم نے اپنے اندر کہاں چھپا کر رکھا ہے ——
تم کیا ہو سروج !!!

(اور گہری روحانی اذیت میں سر جھٹکتا ہوا وہ پھر اپنا سر
باہوں پر رکھ کر میز پر جُھک جاتا ہے۔ بتیاں بُجھ جاتی
ہیں —— پردہ گرتا ہے)

چھٹا منظر

وہی ڈرائینگ روم۔ گریش صوفے پر بیٹھا ہے۔ شب خوابی کے کپڑوں
میں ملبوس، اسکی حجامت بڑھی ہوئی ہے۔ چہرے کا رنگ سیاہ اور
آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے پڑ گئے ہیں۔ وہ دُھواں دھار،
سگریٹ پی رہا ہے اور ابھی سگریٹ ختم ہونے بھی نہیں پاتی کہ
اُسے بڑی بے رحمی سے ایش ٹرے میں رگڑ کر توڑ مروڑ دیتا ہے۔
پھر صوفے پر سر رکھ کر بے چینی کے عالم میں اپنا سر جھٹکتا رہتا
ہے۔ پھر سیدھا ہو کر سگریٹ سُلگاتا ہے اور گہرے گہرے

کش لگاتا ہے۔ سروج ڈرائینگ روم میں داخل ہوتی ہے۔ کچھ لمحے وہیں کھڑی رہ کر گریش کی حالت دیکھتی ہے اور پھر اس کے سامنے آجاتی ہے اور اس کے قدموں میں فرش پر بیٹھ جاتی ہے اور ایک ہاتھ اس کے گھٹنے پر رکھ دیتی ہے۔)

سروج۔ آخر بتائیے تو سہی، آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ نہ دن کو چین نہ رات کو نیند۔ نہ کھانے کی سدھ، نہ پہننے کا خیال۔ ہنسنا بولنا تک چھوڑ دیا۔ اس طرح تو آپ کی صحت بھی گر جائے گی۔

گریش۔ (بے رُخی سے) گر جانے دو۔

سروج۔ دیکھئے ——— میرا خیال نہیں کرتے تو نہ سہی، اپنی کُم کُم ہی کا خیال کیجئے۔ مجھے ڈاکٹر کو بُلانے دیجئے۔

گریش۔ نہیں ——— مجھے کچھ نہیں ہوا۔

سروج۔ ہوا کیسے نہیں؟ ——— آئینے میں دیکھئے، سونا سا رنگ سیاہ پڑ گیا ہے۔

گریش۔ سونا نقلی تھا ——— اس لئے۔

سروج۔ یہ کیسی کیسی باتیں کرتے ہیں؟ کس بات کی مجھے سزا دے رہے ہیں؟ کیا مجھ سے کوئی بھول ہوئی ہے؟

گریش۔ بھول؟ تم سے؟ ——— نہیں۔ بھول تو مجھ سے ہوئی ہے، کیونکہ میں احمق ہوں، اندھا ہوں۔

سروج۔ ضرور مجھ سے کوئی بھول ہوئی ہے۔ مجھے بتا دیجئے، بتا دیجئے، وہ بات کیا ہے!

گریش۔ وہ بات وہ ہے کہ بتاتے ہی زلزلہ آجائے گا، زمین پھٹ پڑے گی، آسمان گر پڑے گا، اور آتش فشاں پہاڑوں کے دہانے کھل جائیں گے، اور ان کا سُرخ سُرخ دہکتا ہوا لاوا مجھے، تمہیں اور کُم کُم کو۔۔۔۔۔۔

سورج ۔۔ (کانپ کر) نہیں نہیں ۔۔ آگے کچھ نہ کہیئے ، بچی کے لئے کچھ نہ کہیئے ۔
گریش ۔ (تڑپ کر) اوہ ۔ میرے دماغ میں زہر چھلک رہا ہے ۔ میری رگوں میں زہریلے
ناگ پھنکارتے پھر رہے ہیں ۔ اُف ۔۔۔۔ آہ
سورج ۔ آپ آرام کیجئے ـــــ سو جائیے ، مَیں سر دباتی ہوں ۔
گریش ۔ (بھڑک کر) نہیں نہیں ۔ مجھے ان ہاتھوں سے نہ چھُوؤ ۔۔۔۔ مت چھوؤ ۔۔۔۔۔
مَیں اب کبھی نہیں سو سکتا جس نے کسی کی ارتھی سے چادر اُتار کر اوڑھ لی
ہو ، مُردے کے اُتارے ہُوئے کپڑے پہن لیے ہوں ، وہ کیسے سو سکتا ہے ۔
سورج ۔ (ہلکی سی چیخ نکل جاتی ہے) بس کیجئے ۔ بھگوان کے لئے ایسی بھیانک باتیں نہ کیجئے ۔
ـــــ مَیں آپ کے پاؤں پڑتی ہُوں ۔
گریش ۔ میرے پاؤں نہ پڑو ـــــ مجھے ہاتھ نہ لگاؤ ، نہیں تو مَیں پاگل ہو جاؤں گا ، گھر
سے نکل جاؤں گا ۔
سورج ۔ لیکن یہ تو بتاؤ ـــــ یہ کس قصور کی سزا ہے ! چار سال سے تم نے مجھے کس پیار
سے رکھا ہے ، ہر بات پر میرا من رکھا ہے ، مجھے سُکھ اور دُکھ میں اپنا شریک
سمجھا ہے پھر اب کیا ہوگیا ـــــ کیا ہوگیا (رو پڑتی ہے) آپ تو کہا کرتے
تھے ۔۔۔۔ !
گریش ۔ وہ سب جھُوٹ تھا ، چھل تھا ، کپٹ تھا ۔
سورج ۔ وہ دھوکا نہیں تھا ۔ آپ کسی کو دھوکا نہیں دے سکتے ۔
گریش ۔ جس طرح کہ تم نہیں دے سکتیں ؟ (بھڑک کر) فریبی ، مکّار ، دھوکے باز عورت
میری نظروں کے سامنے سے دُور ہو جا ـــــ آہ ـــــ آہ ۔
سورج ۔ (تڑپ کر) گریش ! (ایک دو لمحہ ٹھہر کر صدمے کو برداشت کر کے) تم مجھے مار ڈالو
۔۔۔۔۔ میرا گلا گھونٹ ڈالو ـــــ مگر اس مدّت میں ایک دن بھی مَیں نے

تمہارے ساتھ چھل کیا ہو۔ میں کیسے اپنا کلیجہ چیر کر دکھاؤں کہ وہاں چھل نہیں ہے، کپٹ نہیں ہے، دھوکا نہیں ہے۔ میں نے تمہیں ویسے ہی پوجا ہے جیسے پجاری بھگوان کو پوجتا ہے۔ میں نے آج تک تمہاری مورتی کا اپمان نہیں کیا۔

گریش۔ (بڑے بے رحمانہ اور نفرت و حقارت سے جلتے لہجے میں) دیپ شکھا؟

سروج۔ (چیخ مار کر بے ہوش ہوتے ہوئے) گریش!

گریش۔ بے ہوش ہو گئیں؟ (دیوانہ وار قہقہہ لگاتا ہے) ہا ہا ہا..... ہا ہا ہا۔

(قہقہہ لگاتا لگاتا اندر چلا جاتا ہے۔ سروج فرش پر پڑی رہتی ہے۔ روشنیاں بجھ جاتی ہیں۔ پردہ گر جاتا ہے)

ساتواں منظر

(وہی کمرہ لیکن رات کا وقت ہے۔ گھڑی میں چار بجتے ہیں۔ کمرے میں میز پر ٹیبل لیمپ جل رہا ہے۔ ٹیبل لیمپ کے پاس ایش ٹرے میں ایک آدھ جلی سگریٹ سے دھوئیں کی پتلی سی لکیر اٹھ کر کمرے کی تاریکی میں تحلیل ہو رہی ہے۔ فرش پر اور میز پر سگریٹ کے ٹکڑوں کا ڈھیر ہے۔ گریش اپنے ہاتھ میز پر رکھے اور ہاتھوں کی پشت پر رخسار ٹیکے بڑے غور سے دھوئیں کی اس پتلی لکیر کو دیکھ رہا ہے۔ سروج اندر سے کمرے میں آتی ہے اور دھیرے دھیرے چیزوں کا سہارا لے کر آگے بڑھتی ہے اور پھر ایک ساتھ بیتا بھر کے سسکتی ہوئی ہونے پر گریش کی گود میں آ گرتی ہے۔ گریش بڑی بے رحمی سے پیچھے ہٹ جاتا ہے اور سروج مجروح ہو کر اٹھ بیٹھتی ہے)

گریش۔ تمہیں ڈاکٹر مکمل آرام کرنے کے لیے کہہ گیا ہے ——— اندر جا کر آرام کرو جاؤ

سروج ۔ چلی جاؤں گی ۔۔۔۔ لیکن آپ رات بھر کیوں جاگتے رہے ؟ بھگوان کے لئے جا کر کچھ دیر کے لئے سو جائیے ۔ مجھے جو سزا دینا ہے، صبح اُٹھ کر دے دیجئے گا۔

گریش ۔ سزا ؟ کس بات کی سزا ؟ تم نے کوئی چھل نہیں کیا، کپٹ نہیں کیا، دھوکا نہیں دیا۔ میری مُورتی کا اپمان نہیں کیا ۔

سروج ہاں گریش، اس میں ذرّہ برابر جھوٹ نہیں۔

گریش ۔ اوہ، تو بے ہوش ہونے کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ تمہاری طبیعت کافی سنبھل گئی۔

سروج ۔ مَیں اس وقت کچھ نہیں کہوں گی ۔ مَیں تمہارا بڑے سے بڑا الزام ۔ ۔ ۔ ۔

گریش ۔ الزام ؟ تو مَیں الزام لگا رہا ہوں، جھوٹ بول رہا ہوں ؟ ۔۔۔ وفا باز عورت یہ دیکھ (اُٹھ کر کتابوں کے ریک کے اندر سے خطوں کا بنڈل نکالتا ہے اور سروج پر پھینک دیتا ہے) تیرے وہ خط جو تُو نے اپنے پریمی کو لکھے۔

سروج ۔ (بڑے اطمینان سے) گریش ۔۔۔۔ وہ مرچکا ہے، اور اس کے ساتھ سب کچھ مرچکا ہے۔

گریش ۔ لیکن اس کی چتا تمہاری آنکھوں میں بجھی پڑی ہے۔ اس کی ہڈیاں تیرے سینے میں پڑی ہیں اور تُو اُس کی سمادھی کا دیا بن کر جی رہی ہے۔

سروج ۔ (بڑے حساس لہجے میں) کیا تم نے سچ مچ ایسا ہی محسوس کیا ہے گریش ؟ ان چار برسوں میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

گریش ۔ بس بس ۔ مجھے ان چار برسوں کی یاد نہ دلاؤ ۔ یہی چار برس تو مجھے پاگل بنائے ہوئے ہیں ۔ چار سال تک ایک عورت ایک مرد سے کو لٹے میرے سینے سے لگتی رہی، پیار جتاتی رہی، میرے بچے کو دُودھ پلاتی رہی۔ اور مجھے اس کی آنکھوں میں محبت اور چہرے پہ پاکیزگی اور لمس میں گرمی

ہی نظر آتی رہی۔

سروج۔ اور آج نظر نہیں آتی؟

گریش۔ اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ تم عورت نہیں ہو۔ چھل کپٹ کی جیتی جاگتی مورتی ہو۔ تم آج بھی مجھے دھوکا دے سکتی ہو۔ آج بھی جب میں تمہیں دیکھتا ہوں ——— تمہاری آواز سنتا ہوں تو تم مجھے ویسی ہی بھولی، پاک اور معصوم معلوم ہوتی ہو۔

سروج۔ گریش ——— اگر میں تمہیں اپنی آتما کا حال سناؤں تو کیا تم سمجھنے کی کوشش کروگے؟ ——— یہ سچ ہے کہ مجھے ونّود سے پیار تھا ——— بے انتہا پیار۔ مجھے لگتا تھا۔ اس کے بنا میں جی نہ سکوں گی۔ جس دن میں نے سنا، ونّود نے خودکشی کر لی، مجھے لگا میں بھی مر گئی ہوں۔ تین دن اور تین رات میں مُردے کی طرح گُم سُم پڑی رہی۔ نہ کھایا، نہ پیا، نہ بولی نہ چالی۔ موت کی گہری کلپنا میں کھوئی پڑی رہی لیکن چوتھے دن میں نے پایا میں مری نہیں ہوں ——— نہ جانے کہاں میرے اندر ایک آگ ہے، جو مجھے جلائے ہوئے ہے۔ ——— ایک سوتا ہے جو مجھے سرسبز رکھے ہے۔ میں نے اپنا گلا گھونٹنا چاہا، سانس روکنا چاہا۔ طرح طرح سے مرنے کے جتن کئے، مگر آگ نہ بجھی، وہ سوتا بند نہ ہوا ——— وہ کل کل کرتا ہوا میری نسوں میں سرسراتا رہا۔ یہی نہیں۔ دھیرے دھیرے اس کا شور اونچا ہونے لگا۔ اس کی رفتار تیز ہونے لگی۔ اب اس کا شور میرے سارے جسم میں گونج رہا تھا اور اس کی سرسراہٹ میرے انگ انگ کو جگا رہی تھی۔ اور نہ جانے کیسے میں اُٹھ کھڑی ہوئی۔ چلنے پھرنے لگی کھانے پینے بھی لگی۔ چھوئی موئی کی طرح مرجھائی ہوئی میری پلکیں بھی کھلنے لگیں اور مجھے لگا جیسے دنیا میں پھر سے دھوپ پھیلتی جا رہی ہے۔ میں زندگی سے ہار گئی۔

گریش۔ نہیں ——— یوں کہو کہ تم نے اپنی جان بچا لی۔ تم نے وِنّو کے ساتھ بھی دغا کی۔

سروج۔ تم اسے دغا کہہ سکتے ہو لیکن ہم نے ساتھ ساتھ جینا چاہا تھا۔ مرنا ہم میں سے کوئی نہ چاہتا تھا۔ میں نے جی کر وِنّو کے ساتھ کوئی چھل نہیں کیا۔

گریش۔ اور میرے ساتھ ؟

سروج۔ یہی تو میں بتانا چاہتی ہوں۔ گریش جس گھڑی تک میرے تمہارے ساتھ پھیرے نہیں پھرے تھے، میں یہی سوچتی تھی کہ میں تمہیں پیار نہ کر سکوں گی لیکن جس گھڑی پنڈت نے میرا آنچل تم سے باندھا اور ہم ویدی کے گرد پھیرے لینے لگے۔ میرے اندر ایک عجیب سی تبدیلی آنے لگی ——— جیسے کوئی چیز جا رہی ہو، کوئی چیز آ رہی ہو۔ میرے من میں اپنے آپ ایک تصویر سی بننے لگی اور جس گھڑی تم نے میرا گھونگھٹ اٹھا کر میری آنکھوں میں جھانکا، ایک لمحہ کے لئے وِنّو کا چہرہ تلملا کر میری آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ لیکن دوسرے لمحے وہ چمن سے تارے کی طرح ٹوٹا اور نہ جانے کہاں کھو گیا۔

گریش۔ یہ سب جھوٹ ہے، بہلاوا ہے، محبت یوں نہیں مر جاتی۔

سروج۔ یہ ٹھیک ہے، میں نہیں کہتی کہ سب کچھ آسانی سے اپنے آپ ہو گیا۔ مجھے پاپ اور پُن کے وچار سے بھی اپنے کو ڈرانا پڑا۔ میں نے اپنے کو سمجھایا، ان کا کیا دوش ہے۔ انہوں نے تو وِنّو کو تجھ سے نہیں چھینا۔ انہوں نے تو انجانے میں تجھے ویسے ہی چاہا ہے جیسے وِنّو نے۔ پھر انہیں کس بات کی سزا ؟ ان پر کس بات کا غصہ؟ پاپ کے ساتھ ساتھ تو انیائے بھی کرے گی ؟ ——— اور جیسے آتما کے پٹ کھل گئے۔ میں نے تمہیں وہاں بٹھا لیا۔

گریش۔ یہ ناممکن ہے۔ ایک عورت جب ایک بار کسی سے محبت کر لیتی ہے تو دوبارہ کسی اور کو پیار نہیں کر سکتی۔ تم نے مجھے کبھی پیار نہیں کیا۔

سروج ۔ کیونکہ لوگوں کی طرح تم بھی عورت کی محبّت کو ایک شیشہ سمجھتے ہو، جو ٹوٹ کر نہیں جُڑ سکتا؟ گرلش، پہلے مَیں بھی یہی مانتی تھی۔ مَیں نے سُنا تھا، کتابوں میں پڑھا تھا اور ایسا کرنا بھی چاہا تھا، لیکن یہ جھوٹ نکلا۔ عورت بھی انسان ہوتی ہے۔ اس میں بھی زندگی ہوتی ہے، اور زندگی مُردہ چیزوں کے سہارے نہیں، زندہ چیزوں کے سہارے جیتی ہے۔ اس کی سوکھی ڈالی کچھ دنوں بعد پھر ہری ہونے لگتی ہے۔ ماں کا بچّہ مرتا ہے تو اُس وقت وہ دوسرے بچّے کی بات بھی نہیں سوچ سکتی لیکن جب دوسرا بچّہ ہو جاتا ہے تو اُسے پہلے جیسے پیار ہی سے چُومنے چمکارنے لگتی ہے۔

گرلش ۔ یہ بالکل دوسری بات ہے۔

سروج ۔ بات دوسری ہو سکتی ہے مگر اصول وہی ہے۔

گرلش ۔ اگر اصول وہی ہے تو بتاؤ، تم مُسکرا کیوں نہیں سکتیں؟ تمہاری آنکھوں میں اتنی جلدی آنسو کیوں آجاتے ہیں؟ جب مَیں پیار کرتا ہوں، تو تم اُداس کیوں ہو جاتی ہو؟ مَیں تمہارا قہقہہ سُننا چاہتا ہوں تو تم مُسکرا کر کیوں رہ جاتی ہو؟ مَیں تمہیں شوخ رنگ کے کپڑے لا کر دیتا ہوں تو تم پہننے سے انکار کیوں کر دیتی ہو؟ کیا تم ونود کے مرنے کا سوگ نہیں منا رہی ہو؟

سروج ۔ گرلش، میرے ساتھ تم ہو، میری بچّی ہے۔ اور عورت کے سامنے جب یہ دو چیزیں ہوتی ہیں تو وہ سوگ منانا چھوڑ دیتی ہے، آس منانے لگتی ہے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ پہلے جیسی اُمنگ دل میں نہیں اُٹھتی، ایک گھٹن سی رہتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے بہت سا خون نکل گیا ہے۔ اور جسم میں ایک پتلی سی دھار دھیرے دھیرے بہنے کے لئے رہ گئی ہے۔ گرلش، جو موت کی کھائی میں جھانک کر لوٹ آئے، وہ شاید پھر قہقہہ نہیں لگا سکتا۔ لیکن وہ سُکھ پھر

بھی دے سکتا ہے۔ اس کے پیار میں سُورج کی گرمی نہ سہی، چندرما کی شیتلتا ضرور رہتی ہے۔

گریش۔ یہ ٹھیک ہوسکتا ہے، سچ ہوسکتا ہے، پر میں یہ کیسے بھول جاؤں کہ تم کسی سے محبت کر چکی ہو، زندگی کے حسین ترین سپنے تم نے جس چہرے کے گرد بُنے تھے، وہ میرا چہرہ نہیں، کسی اور کا تھا۔

سرُوج۔ مگر وہ سب کچھ مُرجھا چکا ہے۔ اب کونپلیں پھر سے پھوٹی ہیں۔

گریش۔ لیکن اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ اَب مَیں تمہارے ساتھ خوش نہیں رہ سکتا۔ اپنے من کو نہیں سمجھا سکتا۔

سرُوج۔ گریش، یہ زندگی کی سچائی نہیں، سنسکاروں[1] کا ہٹیلاپن ہے۔ میرے سنسکاروں نے بھی یہی کہا تھا کہ تو اپنے پتی کو نہ چاہ سکے گی۔ ایک بار محبت کرکے دُوسری بار نہ کر سکے گی۔ ایسا سوچنا اچھا لگتا ہے۔ یہ خیال خوبصورت ہے، شاعرانہ ہے۔ اس خیال میں ویسا ہی ہلکا ہلکا مہلک نشہ ہے، جیسا موت کی کلپنا میں ہوتا ہے۔ اس کلپنا کے سامنے زندگی کی چاہت ظالمانہ سی لگتی ہے۔ بدنما اور غیر شاعرانہ لگتی ہے لیکن زندگی کی یہ چاہت ہوتی زندہ ہے۔ لیکن کیا تم اس چاہت کا گلا گھونٹنا چاہو گے؟ کیا تم بھی ان سنسکاروں کی بات پہ کان دھرو گے۔ جو کہیں گے کہ مجھے وِنُود کے ساتھ ستی ہو جانا چاہیئے تھا۔ کیا تم بھی میرا ستی ہونا چاہو گے؟

گریش۔ مَیں کچھ نہیں جانتا، مَیں کیا کہوں گا۔ مجھے کچھ نہیں معلوم کہ مجھے کیا کہنا چاہیئے، کیا کرنا چاہیئے ——— میرے ذہن میں کُہر سی بھر گئی ہے۔

سرُوج۔ یہ کُہر سنسکاروں کی کُہر ہے گریش ——— سنسکار جو مُردہ خیالوں کے اندھے

---

[1] راویت اور ورثہ میں ملے ہُوئے غیر منطقی خیالات

بھوت ہوتے ہیں۔ ان بھوتوں کے بہکائے میں نہ آؤ۔ کیونکہ یہ زندگی کے دوست نہیں ہوتے۔ دشمن ہوتے ہیں۔

گریش۔ لیکن میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یہ ایک مسموم دھوئیں کی طرح میرے وجود کی گہرائیوں سے پیچ در پیچ اُمڈتے چلے آ رہے ہیں۔ یہ مجھ پر پوری طرح چھا گئے ہیں۔

سروج۔ اِس وقت یہ تم پر ضرور چھائے رہیں گے گریش، کیونکہ سنسکار خیالات سے زیادہ گھنے ہوتے ہیں۔ یہ زہریلی گیسوں کی طرح ہمارے وجود کی نچلی سطحوں میں دُور دُور تک پھیلے ہوتے ہیں لیکن کُہر کی طرح یہ ہمیشہ چھائے نہیں رہتے۔ جذبات کی رات کے بعد سوچ کا سُورج جیسے جیسے چڑھتا ہے، ان کا کُہر چھٹتا چلا جاتا ہے۔ گریش، تم میری قسمت کا فیصلہ جذبات کی اس اندھیری رات میں نہ کرو۔ سوچ کی وہ صبح بھی ہو جانے دو، جو تمہیں اس اصلیت کا رُوپ دِکھائے گی۔ کہ میں نے کسی کے ساتھ چھل نہیں کیا، کسی کو دھوکا نہیں دیا۔ میں نے صرف اِس طاقت کے آگے سر جھکایا ہے، جسے زندگی کہتے ہیں۔

(اور یکایک جیسے گریش کے اندر روشنی ہو جاتی ہے۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوتا ہے ـــــ مبہوت سا، حیرت زدہ سا سروج کی طرف دیکھتا ہے ـــــ دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتا ہُوا وہ سروج کے قریب آتا ہے اور پھر ایک ساتھ اُسے سینے سے لگا کر اپنا سر اُس کے کاندھے پر رکھ دیتا ہے ـــــ سروج جو اب تک جذبات کی سطح سے بہت اوپر اُٹھی ہوئی تھی۔ یکلخت جذباتی ہو اُٹھتی ہے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے ہیں۔ اور سبک سبک کر رونے

لگتی ہے۔ مگر لیشیں تھوڑی دیر تک کچھ نہیں کہتا، پھر اُسے اپنے سے الگ کرتا ہے۔ اس کے پلو سے اُس کے آنسوؤں کو پونچھتا ہے۔ اور پھر اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کھڑکی کی طرف لے جاتا ہے، جہاں رات کی سیاہی کی جگہ صبح کی سرخی نے لے لی ہے ——— دونوں نظریں اٹھا کر ایک ساتھ اس صبح کو دیکھتے ہیں، جو ابھی ابھی تاریکی کے بطن سے پیدا ہوئی ہے)

(پردہ)

روی :- .. .. ایک آزاد خیال نوجوان

باپ :- .. .. .. ایک سخت گیر انسان

ماں :- .. .. محبت سے سرشار شخصیت

کیشو :- چھوٹا بھائی ؛ گوبند :- بڑا بھائی

کملا :- چھوٹی بہن ؛ بھابی :- بڑے بھائی کی بیوی

(ایک متوسط درجہ کے گھر کا آنگن۔ ایک عورت جس کی عمر ۵۵ سال کے قریب ہے بیٹھی چرخہ کات رہی ہے۔ اس کا چھوٹا لڑکا باہر سے بھاگا بھاگا آتا ہے۔)

کیشو۔ (باہر سے بھاگا آتا ہے) ماں، او ماں۔ چاچا کھیت سے آگئے۔ وہ آ رہے ہیں۔

ماں۔ تو ابھی کیوں گھر میں چلا آیا؟ جہاں صبح سے گلی ڈنڈا اور گولی کنچے کھیل رہا تھا، ڈٹ کے کیوں گھر میں گھس رہے ہے؟

کیشو۔ ماں، میں تیرے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ تو اُن سے کچھ مت کہیو۔ اب میں باہر نہیں جاؤں گا۔

ماں۔ کیوں؟ باہر کیوں نہ جائیگا؟ صبح سے میں تجھے بلا بلا کے تھک گئی۔ پر تُو تو گلی ڈنڈے میں مگن تھا۔ اب باپ کے آتے ہی کیوں بھیگی بلی بنے ہو۔ آنے

دے اُنہیں۔

کیشو۔ ماں، مَیں تیرے پَیروں پڑتا ہوں۔ اُن سے کچھ نہ کہنا، وَرنہ وہ میری کھال اُدھیڑ دیں گے۔ میری اچھّی ماں ـــــ مَیں کتاب لے کے بیٹھتا ہوں۔ تم اُن سے کچھ نہ کہنا۔

(اندر کوٹھے میں کتاب لے کر بیٹھ جاتا ہے۔ اس کے والد اندر داخل ہوتے ہیں۔)

ماں۔ آج کھیت سے آنے میں بہت دیر لگا دی؟

باپ۔ (غصّہ میں) کیشو کہاں ہے؟

ماں۔ کوٹھے میں ہے۔ پڑھ رہا ہے؟

باپ۔ وہ پڑھ رہا ہے؟ باہر گلی میں گلّی ڈنڈا کھیل رہا تھا، اور مجھے دیکھ کر گھر میں آن گھُسا ہے۔

ماں۔ کہاں، وہ تو صبح سے یہیں کتاب پے جھُکا بیٹھا ہے۔ تمہیں تو ویسے ہی ہر بات کا بہم ہو جاوے ہے۔

باپ۔ دیکھ، مَیں تجھے لاکھ بار سمجھا چکا ہوں کہ اپنے بیٹوں کے عیبوں پہ یہ دہ ڈالنے کی کوشش مت کر۔ ان کی بےجا حمایت مت کر ورنہ ایک دِن مونڈ پکڑ کے روئے گی۔ تُو نے اُس بڑے کو تو بگاڑ کے رکھ دیا۔ اب اس چھوٹے کو بھی ہاتھوں سے نکال دینا چاہتی ہے؟

ماں۔ تم تو بات بے بات اُس بڑے پے غصّہ اُتارنے پے تُلے ہو۔ آخر اُس میں کیا خرابی ہے؟ وہ کون سا بے بہرا ہو گیا؟ شہر سے ہرا ٹھوا رہے نہیں آکے دیکھ جاوے ہے۔ تنخواہ میں سے جو کچھ بچے ہے، وہ ہاتھ پے رکھ جاوے ہے۔ دُنیا کے بیٹوں کو تو دیکھو ــــــ

باپ۔ دیکھ، پھر تو نے میرے سامنے دنیا کا نام لیا؟ دنیا بھاڑ میں جا رہی ہے تو میں تو اس کے ساتھ بھاڑ میں نہیں جا سکتا۔ بات بات پہ دنیا کی بات لے بیٹھتی ہے۔ دنیا کا سر پھر جائے، دنیا دین دھرم سے ڈگ جائے، اپنا گھر لٹانے لگے، اپنی اولاد کو بگاڑنے لگے۔ تو میں تو اس کی نقل نہیں اتاروں گا۔ میرے اپنے اصول ہیں۔

ماں تو وہ تمہاری کونسی بات پہ نہیں چلتا؟ کوئی بری چیز وہ نہ کھاتا، کوئی برے کام وہ نہ کرتا پیسہ وہ برباد نہ کرتا۔

باپ۔ بس، تو تو پیسوں پہ مرتی ہے۔ وہ ہر مہینہ آکر تنخواہ کا ایک حصّہ دے جاتا ہے اور تو سمجھتی ہے، وہ پوری طرح راہِ راست پر ہے۔ تجھے کیا معلوم، کہ اس کی ضد کی وجہ سے دنیا اب مجھے ٹوکنے لگی ہے۔

ماں۔ کیا ٹوکے ہے، اور کس بات پہ ٹوکے ہے دنیا؟ میرے ریتو میں کیا عیب دیکھا ہے کسی نے۔

باپ۔ دنیا عیب دیکھتی نہیں، عیب نکالتی ہے۔ انہیں تو انگلی اٹھانے کا موقعہ ملنا چاہیئے۔ اس کی عمر اب ۲۶ سال ہونے کو آئی، مگر وہ بیاہ ہی نہیں کراتا۔ لوگ باگ اب مجھ سے آکر پوچھنے لگے ہیں کہ پنڈت جی لڑکے کی شادی کیوں نہیں کرتے۔ آپ تو اتنے سخت مزاج کے آدمی ہیں۔ کیا آپ کا بیٹا آپ کی بات نہیں مانتا؟

ماں۔ تو لوگوں کی بات پہ کیا جوان بیٹے سے لڑنے بیٹھو گے؟

باپ۔ یہ لوگوں ہی کی بات نہیں، یہ دنیا داری کی بات ہے۔ شادی کی ایک عمر ہوتی ہے۔ اگر لڑکا اس عمر سے نکل جائے تو اس کے لیے اچھا رشتہ نہیں آتا۔ اس کی ہوا بگڑ جاتی ہے۔ اور پھر گر کر بیاہ کرنا پڑتا ہے۔

ماں ۔ جس کو گر کر بیاہ کرنا پڑتا ہو، وہ ڈرے ۔ میرے دروازے پر تو صبح شام ڈپٹی کلکٹر آ کے ناک رگڑتے ہیں ۔

باپ ۔ لیکن اسی طرح کچھ دن تک اور لوگ ناک رگڑ رگڑ کر لوٹتے رہے تو پھر کوئی بھی آ کے نہیں پھٹکے گا ۔ لوگ ابھی سے باتیں اُڑانے لگے ہیں ۔ کوئی کہتا ہے لڑکے میں خرابی ہوگی ۔ کوئی کہتا ہے مہاراج کسی سونے کی چڑیا کے انتظار میں بیٹے کو بُڈھا کر رہے ہیں ۔ اُس کی ضد سے میری پوزیشن میں فرق آنے لگا ہے ۔

ماں ۔ پر وہ نہیں مانتا، تو تم کیا کرو گے ؟

باپ ۔ مَیں ؟ مَیں ایک حد تک نرمی سے کام لیتا ہوں جب تک گھوڑا تھپکی سے چلتا ہے، مَیں اُسے تھپکی دیتا ہوں ۔ جب وہ ٹِک ٹِکانے کی ضرورت ظاہر کرتا ہے ۔ مَیں اُسے ٹِک ٹِکاتا ہوں ۔ لیکن اگر مجھے پتہ چل جائے کہ چابک اُٹھائے بغیر کام نہیں چلے گا تو ——

ماں ۔ تو کیا اُسے چابک مارو گے ؟

باپ ۔ تُو بھی رہی گنوار کی گنوار ۔ تجھے ساری عمر مَیں نے پڑھایا، مگر تجھے نہ بات کرنے کا سلیقہ آیا اور نہ بات سمجھنے کا ۔ کہتا ہوں کمبخت کی سمجھنی ہے کھلیاں کی ۔ مَیں کہتا ہوں ۔ اب کے ساہے میں مجھے اُس کی شادی ضرور کر دینی ہے، خواہ وہ رضامند ہو یا نہ ہو ۔ اب تک مَیں اسکی ہاں کے انتظار میں تھا ۔ اب مَیں اُس سے نہیں پوچھوں گا —— اس کمبخت کی "ناں ناں" میں وہ دیرہ دُون والے کا رشتہ نکل گیا، وہاں رشتہ ہوتا تو بڑا مال ملتا ۔

ماں ۔ پس تم تو مال سمیٹنے کی پھِراک میں بیٹھے ہو ۔ میرا بیٹا مال کے لوبھ میں نہ پھنستا ہے ۔

باپ ۔ ہاں کیا کہنے ہیں تیرے بیٹے کے، اور تیرے —— بیاہ میں ایک

ذری کا تہیں نہ ملی تو اچھی خاصی بہو میں سو سو عیب نکالتی پھرے گی۔

ماں ۔ خیر میں تو جو کروں گی سو کروں گی، پر تم اپنی کہو۔ اگر تمہاری جھولی نہ بھری، تو تم بیٹے کو بیدی پر سے اُٹھا لاؤ گے۔ بڑے بیٹے کے بیاہ میں یاد ہے نا۔ روپے کم ملنے پہ کتنے بھڑکے تھے۔ ایک ملٹ میں بیٹی والے کی آبرو خاک میں ملا دی تھی۔

باپ ۔ دیکھ اب تو غصہ دلانے کی باتیں کرنے لگی۔ مجھے غصہ آگیا، تو پھر کہے گی، بڑھاپے میں میری آبرو کرکری کر دی ہو۔ بس تو اب میرا حقہ تازہ کر کے چلم بھر دے۔ مجھے باہر جانا ہے۔

ماں ۔ تو میں ہی کونسا لڑنے کو فالتو بیٹھی ہوں۔ میرا تو صبح سے کچھ بھی کام نہ ہوا۔ دودھ بلونے کو پڑا ہے۔ گوبر تین دن کا اکٹھا ہوا پڑا ہے تھاپنے کو۔ اور دن اتنا چڑھ آیا۔ چلوں چولھا جلاؤں۔ ہاں یہ تو بتاؤ، کھیت سے کیا کیا لائے ہو؟

باپ ۔ ٹماٹر ہیں۔ گوبھی کا پھول، سیم کی تازہ تازہ پھلیاں۔

ماں ۔ آج تو بڑی سبزی لے آئے؟

باپ ۔ وہ بھی تو شام کو آتے گا نا۔ اُس کے لئے دو تین سبزیاں تو چاہیں۔

ماں ۔ اوہو، ابھی تو بیٹے کے چاپک لگانے جا رہے تھے۔ اور اب بیٹے کی خاطر کی تیاری کی جا رہی ہے۔ تمہارا ابھی کچھ پتہ نہ چلتا۔ کبھی تو آنکھ دکھا کر بیٹوں کا خون سکھا ڈالو ہو۔ کبھی ایسے لاڈ پیار پہ اُترتے ہو کہ بس۔

باپ ۔ تجھے کیا معلوم کہ باپ کا دل کیسا ہوتا ہے۔ ماں کا کام تو بیٹے، بیٹیوں کو لاڈ پیار کر کے ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن باپ پہ اُن کو قابل اور لائق بنانے کی ذمہ داری ہوتی ہے، اگر وہ اولاد کو آنکھ نہ دکھلائے اور ماں کی طرح نرم بن جائے، تو اولاد بگڑ جائے، بے قابو ہو جائے۔ اور دنیا کی روش کا شکار بن جائے۔

باپ کو تو اپنی اولاد کے سامنے چھاتی پر پتھر رکھ کر آنا پڑتا ہے ٭

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

دُوسرا منظر

(وہی منظر۔ ماں کھانا بنا رہی ہے۔ اس کا بڑا بیٹا رُوی بیٹھا کھانا کھا رہا ہے۔)

ماں۔ ارے لے۔ ایک پراٹھا تو اور لے۔

روی۔ نہیں ماں۔ نہیں مجھے اب بالکل بھُوک نہیں رہی۔

ماں۔ ارے لے گا بھی۔ دیکھ کتنا کرکرا بنا ہے مرجاؤں گی تو یاد کیا کرے گا کہ ایک ماں تھی جو ایسے پراٹھے بنا کے کھلایا کرتی تھی۔

روی۔ تُو بھی کیسی کیسی باتیں کیا کرتی ہے ماں۔

ماں۔ کیوں؟ کیا میں جھُوٹ کہہ رہی ہوں۔ پچاس سے اُوپر کی میری عمر ہونے کو آئی۔ دانت میرے گر گئے۔ تو رمیرا گھٹ گیا، شریر میرا تھک گیا۔ چھاچھ یا دودھ میں بھگو کے دو چار ٹکڑے نگل لوں۔ تو نگل لُوں، ورنہ میری تو بھُوک بھی مر گئی۔

روی۔ ہاں پچھلے دِنوں میں تُو بہت ہی تھک گئی ہے۔ کام بھی تو سارا خُود ہی کرنا پڑتا ہے۔

ماں۔ کام کی تو کچھ نہ ہے بیٹا۔ بس نرا آگا ئے کا کام زیادہ سمجھ لے۔ دُکھم سُکھم اُٹھ بیٹھ کے کر ہی لُوں ہوں (پھونک مارتے ہُوئے) لکڑی بھی گیلی ہیں۔ آگ ہی جلتی۔ اصل بات یہ ہے کہ اب میری نیرے چاچا کی روز کی لڑائی سہنے لگی ہے۔

روی۔ کیوں، کس بات پہ ؟

ماں۔ کوئی بات ہو تو کہوں بھی۔ بیٹھے بٹھائے بس کسیوں بات پہ بگڑ پڑیں ہیں۔ اب میں اکیلی کیا کیا کام کروں اور کس کس کی بات سنوں۔ کچھ کہوں ہوں تو کہہ دیویں کہ تیری میری نہیں نبھتی، تو اپنے بیٹے کا بیاہ کر لے اور اس کے ساتھ چلی جا۔

روی۔ (بات سمجھ کر) ہوں، ماں چاچا سے کہنا ہی پڑے گا۔ ڈر کے مارے میں کچھ کہتا نہیں ہوں ــــ لیکن اس عمر میں بھی اُن کا تم سے لڑنا، تم کو پھٹکارنا غلط ہے۔ ایک تو ان سے یہ نہیں ہوتا کہ ایک نوکر رکھ لیں، جو اُوپر کا کام کرے۔

ماں۔ بیٹا، مجھے نوکر ووکر نہ چاہئیے۔ کام وام میں سب کر لوں گی۔ مجھے تو اب اکیلا گھر بھاڑ کھانے کو آوے ہے۔ بہو گھر میں ہو، تو تیرے چاچا بھی مجھ سے نہ لڑیں۔ بہو بیٹی کے سامنے اُن کی بھی زبان نہ کھُلے۔ اب اکیلی پا کے جو اُن کے جی میں آوے ہے، سنا دیویں ہیں۔

روی۔ میں سب کچھ سمجھتا ہوں ماں

ماں۔ تو پھر سمجھ دار ہو کر نادان کیوں بنے ہے ؟ ہم دونوں کا بڑھاپا آگیا۔ ہمیں بھی آرام کی ضرورت پڑنے لگی ہے بڑا لڑکا گود نہ دے دیتے تو اب تک بہو آنگن میں ڈولتی اور پوتے گھر میں کھیلتے۔ وہ بھی یہی کہیں ہیں کہ بھئی بیٹے بھی ہوئے لیکن نہ گھر کے آگے باجا بجا اور نہ ڈیوڑھی کے باہر پنچ اکٹھا ہوئے۔ دنیا کے لڑکوں کو گھوڑی پہ چڑھتے دیکھے ہیں اور ٹھنڈی سانس بھر کے رہ جاویں ہیں۔

روی ۔ ماں، میں سب کچھ محسوس کرتا ہوں، میں سب کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ مگر کیا کروں۔

ماں۔ کیوں، تجھے کیا دِقّت ہے ؟ تجھے کس بات کی کمی ہے ؟ اچھی نوکری تجھے مِلی ہوئی

ہے۔ ماں باپ، بھائی بہن تیرے اُوپر ہیں۔ گھر میں بھگوان کا دیا سب کچھ ہے۔
روزا چھے سے اچھے رشتے آویں ہیں ـــــ گھر میں گیہوں، گھی، کھانڈ،
زیور، کپڑا لتّا سب کچھ تیار رہے ہے۔ بس ایک تیری ہاں کی دیر ہے ـــــ
ہاں کر دے بیٹا۔

روی۔ ماں۔ (کہتے کہتے رُک جاتا ہے)

ماں۔ کیا ہے؟ تُو کیا کہنا چاہوے رہے ہے؟ اپنی ماں سے تُو اپنے من کی کہہ۔
مَیں اُن سے نہیں کہوں گی۔ تُو مجھے بتا دے کہ تُو کیا چاہوے ہے۔ کیسی لڑکی
کیسا گھر، کیسا لین دین۔ ہم تیرے لئے ویسا ہی بندوبست کر دیں گے۔

روی۔ ماں، مَیں ایک لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہُوں۔

ماں۔ تو تُو نے آج تک کیوں نہ کہا؟ اپنے چاچا کو کیوں نہ بتایا؟ کہاں ہے وہ لڑکی؟

روی۔ شہر میں ہے ماں۔

ماں۔ تو اپنے چاچا کو اُس کے ماں باپ کا پتہ بتا دے اور دِن طے کر کے اُن کو یہاں
بھیج دے۔ ہم بات پکّی کر لینگے۔

روی۔ مگر ماں، چاچا کبھی نہ مانیں گے۔

ماں۔ کیوں، کیا نکس ہے اُن میں؟ گریب ہیں وہ؟

روی۔ نہیں ماں۔ وہ دوسری ذات کے ہیں۔

ماں۔ (تقریباً چیخ کر) ربیو۔

روی۔ وہ کھتری ہیں ماں۔

ماں۔ یہ کیسے ہوسکے گا ربیو۔ ہم تو براہمن ہیں۔ ہم ایک دُوسری ذات کی لڑکی کو گھر میں
کیسے لاسکتے ہیں۔

روی۔ مگر دوسری ذات میں کیا خرابی ہے۔

ماں - خرابی ہی تا ہے؟ بھلا خرابی کیسے نا ہے؟ کہاں برہمن، کہاں کھتری -
ایک اُونچی ذات، ایک نیچی ذات - بیٹا ایسی بات دل سے نکال دے - کوئی
اپنی ذات کی لڑکی ڈھونڈ لے یا ہم سے کہہ دے - ہم تیری مرضی کی لڑکی ڈھونڈ
دیں گے -

روی - مگر میں تو اُس لڑکی سے شادی کرنے میں کوئی خرابی نہیں سمجھتا -

ماں - مگر تیرے سمجھنے سے کیا ہوتا ہے بیٹا - تیرے چاچا اور دُوسرے لوگ تو اِس
بات کو نہیں مان سکتے - وہ کبھی راضی نہیں ہو سکتے، اور پھر ضرورت بھی کیا
ہے یہ کام تو اُن کے کرنے کے ہیں - جو اپنی برادری میں گرے ہوئے ہوں اور
جن کے رشتے نہ آتے ہوں - ہمارے تو دن بھر رشتہ والے آ کے اُلٹے
پھرتے ہیں -

روی - مگر میں تو اُس سے شادی کرنے کا وعدہ کر چکا ہوں ماں - اور کہیں نہ کر
سکوں گا -

ماں - دیکھ ربیو - تو پڑھا لکھا سمجھ وال ہو کے ایسی بات مت کہہ - تُو سب سمجھے
ہے کہ ہمارے گھر کی کتنی عزّت ہے - تیرے چاچا چاچا برادری کی ناک ہیں - تیرے
بھائی ہیں - ان کی اولادیں بیاہنے کو ہیں - یہ تو ناک کٹنے برابر ہے -

روی - تو پھر میں شادی ہی نہیں کروں گا -

ماں - دیکھو اب تو مجھ سے توڑا ٹوٹن کی بات کر رہا ہے - پھر کہے گا، تو بے بات
ناراض ہو گئی - میں تیرے اُوپر آس لگائے بیٹھی ہوں - برادری کی بھاجی
کھائے بیٹھی ہوں - مجھے اپنے ہاتھ سے بیاہ کرنے دے اور برادری
کا قرض چکانے دے - تیرے بیاہ کی آس میں تو میں سب کے ہاں تلک
اور بہوؤں کو منہ دکھائی دے کر آئی ہوں - اب مجھے بھی تو اُن سے

تلک اور منہ دکھائی لے لینے دے۔

روی - مگر میں تو تم کو بھاجی بانٹنے یا تلک وغیرہ لینے سے نہیں روک رہا۔

ماں - روک کیسے نہیں رہا۔ ایسی بے جات کی شادی کرے گا تو میں نے بانٹ لی بھاجی اور لے لیا تلک۔ یہ تو برادری کا معاملہ ہے۔ برادری ایسے بیاہ میں آکے نہ جھانکے گی۔ ایسے بیاہ پردیس میں ہو سکتے ہیں۔ اپنی ڈیوڑھی پہ نہیں ہو سکتے۔

روی۔ تو تم شہر جاکر میرا بیاہ کر دو۔

ماں۔ رہیو، دیکھ اب تک تو میں سمجھتی تھی کہ تو ویسے ہی کہہ رہا ہے۔ پر اب مجھے پتہ لگے ہے، تو میرے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ بیٹا مجھے یہ بات پسند نا ہے۔ کہے دوں ہوں کہ آج منہ سے نکالی سو نکالی، پھر آگے ایسی بات منہ پر بھی نہ لائیو۔ جو تیرے چاچا نے سن لی، تو ماں بیٹے دونوں کو گھر سے نکال کر پانی پیویں گے۔

باپ۔ (اندر آکر) ارے بھئی۔ دیکھو تو کون آئے ہیں۔

ماں۔ (گھبرا کر) دیکھ تیرے چاچا آ رہے ہیں۔ ان کے سامنے کچھ مت کہہ دیجو۔ تجھے میری قسم۔ کبھی اپنے ساتھ ساتھ میری بھی درگت کرائے۔ کون آیا ہے جی۔ (روی کے والد کے ساتھ ان کا بڑا لڑکا گوبند داخل ہوتا ہے) ارے گوبند تو ـــــ تو کیسے راستہ بھول گیا؟

گوبند۔ رام رام ماں۔

ماں جیتا رہ۔ بھگوان ایک اور بیٹا دے۔

روی - بھیا نمستے۔

گوبند۔ کہو بھئی کہاں موٹر سے آگئے تھے؟

رودی ۔ جی ہاں ۔ ریل کافی دیر سے آتی ہے ۔ اس لئے موٹر سے ہی چلا آیا ۔

باپ ۔ کیوں کیشو، تمہارا بڑا بھائی آیا ہے اور تم اتنے بدتمیز ہو کہ نمستے بھی نہیں کی ؟

گوبند ۔ ابھی چھوڑو بھی ۔ بڑا ہو کر سب کچھ سیکھ جائے گا ۔

باپ ۔ نہیں جی ۔ یہ ضروری ہے کہ یہ ابھی سے تمیز اور عزت کرنا سیکھے ۔ کھڑے ہو ۔ ہاتھ جوڑ کر نمستے کرو اور معافی مانگو ۔

کیشو ۔ نمستے بھیا ۔

گوبند ۔ نمستے ۔ اب بیٹھ جاؤ ۔ آؤ میری گود میں بیٹھ جاؤ ۔

ماں ۔ ارے کیوں اپنے اوپر لاد رہا ہے ۔ پہلے بیٹھ کے کھانا کھا ۔ گرم گرم پراٹھے بنا رہی ہوں ۔

گوبند ۔ نہیں ماں ۔ میں تو کھانا کھا کے چلا ہوں ۔

باپ ۔ ارے بھئی، ایک آدھ تو کھا ہی لو ۔

گوبند ۔ نہیں پتا جی ۔ میں کھا کے ہی چلا تھا، اور اب پراٹھا کیا کھائیں گے ۔ اب تو ہم رودی سے مٹھائی ملے کرنے آئے ہیں ۔

باپ ۔ چلو بھائی، تم آگئے ہو، ہمارا بوجھ ہلکا ہوا ۔ اب بھائی بھائی بات طے کر کے ہم کو بتا دو ۔ ہم اُس موافق کام سر انجام دیدیں گے ۔

گوبند ۔ ہاں بھائی رودی اب بتاؤ ۔ کب منہ میٹھا کرا رہے ہو ؟ بھئی ہم تو کچھ پڑھے لکھے تھے نہیں، اس لئے سسرال بھی گنوار ملی ۔ مگر تم لکھے پڑھے ہو تمہارے سہارے ہم کو بھی میز کرسی پر بیٹھ کر کھانا نصیب ہو جائیگا ۔

باپ ۔ دیکھو لو بھئی، تمہارے بڑے بھائی کو تمہاری شادی کا شوق ہم سے بھی زیادہ ہے ۔ آج یہ ایک رشتہ لیکر آئے ہیں جو بالکل تمہارے خیالات

کے مطابق ہے۔ الہ آباد میں انکم ٹیکس آفیسر ہیں، ان کی لڑکی ہے اور بی اے میں تعلیم پا رہی ہے۔

گوبند۔ اور ماں، لڑکی روی کی طرح ہی پتلی چھریری اور خوبصورت ہے۔

باپ۔ (مسکراتے ہوئے) اور یہ بھی تو کہو کہ وہ ان حضرت کو جانتی ہے۔

روی۔ (گھبرا کر) مجھے؟ میں... میں کسی انکم ٹیکس، وِنکم ٹیکس آفیسر کی لڑکی کو نہیں جانتا۔

باپ۔ تو ایک ساتھ اتنے گھبرا کیوں گئے۔ ہم تو یہ جان کر خوش ہوئے ہیں۔ کہ وہ تم کو جانتی ہے۔

گوبند۔ اور محض جاننا ہی کیا، وہ تو اس کی معتقد بھی ہے۔

روی۔ (اور زیادہ بوکھلا کر) مگر میں، میں جو کہہ رہا ہوں کہ میں ایسی کسی لڑکی کو نہیں جانتا۔ الہ آباد میں کسی لڑکی سے تو کیا، میرے کسی لڑکے سے بھی مراسم نہیں ہیں۔

باپ۔ تو ہم نے یہ کب کہا کہ تمہارے اس سے مراسم ہیں۔ یہ کوئی ضروری تو نہیں کہ جو تم کو جانتا ہو، اس کو تم بھی جانتے ہو؟

روی۔ کیوں؟ ضروری کیوں نہیں؟

گوبند۔ اجی آپ نے تو بیچارے روی کو چکر میں ڈال دیا۔ دیکھئے تو وہ کس قدر گھبرا گیا ہے۔ ارے بھئی بات صرف اتنی ہے کہ تم اخباروں میں لکھتے ہو، اور اس لڑکی نے تمہاری چیزیں پڑھی ہیں۔ اس کے پتا جی یہی بتاتے تھے، کہ شروع میں وہ بھی روی کے لئے شادی سے انکار کرتی تھی۔ لیکن جب اسے معلوم ہوا، کہ اس کی شادی روی سے ہونے والی ہے تو اس دن سے اس نے انکار کرنا ہی بند کر دیا۔

باپ۔ ارے، یہ لڑکے اخبار میں مغز پچی خواہ مخواہ تھوڑا ہی کرتے ہیں۔ دیکھو کہاں کہاں بتا لیتے ہیں، اپنے بھگت۔ ارے بھئی تو آج چُپ کیسے ہے ؟ گوبند تیرے لئے بھی تو ہزار روپیہ کی ملنی کی بات پکی کر آیا ہے۔

ماں۔ مجھے کون پُوچھے ہے۔ ہزار روپیہ کیا مجھے چھاتی پہ دھر کے لے جانے ہیں

باپ۔ گوبند، یہ تمہاری ماں کی صفت ہے، اسے لیٹنے کو کہو، تو کھو دنے کو کہے گی اور کھو دنے کو کہو تو لیٹنے کو کہے گی۔ اگر یہ سیدھی بات کا سیدھا جواب دے دے تو اس کی شان میں فرق نہ آجائے۔

ماں۔ میں تو پاگل ہوں گنگا ڈُں کی گنوارن ہوں۔ عقلمند تو تم سب ہو، تم ہی سمجھا لیے، بیٹھا تو ہے تمہارے سامنے۔

گوبند۔ چاچا، تم بھی ماں کو ناراض کر دیا کرتے ہو۔ باتیں خوشی کی کر رہے ہیں اور آپ نے ایسی بات چھیڑ دی۔ ہاں بھئی روی، یہ رشتہ تو تمہارے لائق ہے ؟

باپ۔ بھئی بولو، جواب دو۔

ماں۔ (خاموشی) ارے بولتا کیوں نا ہے یا ماں کے اُوپر ہی شیر ہونے کو ہے

باپ۔ (چونکنا ہو کر) کیا بات ہوئی ہے ؟ کیا کہا ہے روی نے ؟

ماں۔ پُوچھ لو اِسی سے۔ ارے اب بکارتا کیوں نا ہے ؟

کیشو۔ چاچا ! بھتا کہیں اور شادی کرےنا . . . .

باپ۔ کیا کہا ؟ یہ کیا قصّہ ہے، روی۔ تم کہیں شادی کی بات طے کر چکے ہو ؟

روی۔ (خاموش دبے لہجے) جی ہاں۔

باپ۔ (زور سے) کہاں ؟

روی۔ شہر میں !

باپ ۔ کس کے یہاں؟ کون ہیں؟ پوری باتیں بتاؤ۔

روی ۔ وہ کھتری ہیں۔

باپ ۔ (گرج کر) روی تم ہوش میں ہو۔

گوبند ۔ کیا کہہ رہا ہے روی تو۔

روی ۔ میں نے وعدہ کر لیا ہے۔

باپ ۔ بے شرم، بے غیرت۔ اپنے باپ کے منہ پہ یہ باتیں کہنے سے پہلے مر نہ گیا۔ تو نے کس سے پوچھ کر وعدہ کیا؟ کس کے بوتے پہ اتنی جرأت کی؟

روی ۔ کسی کے نہیں۔ میں نے سمجھا، یہ غلط نہیں ہے۔ اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔

باپ ۔ تیرے لیئے تو بھنگی، چمار، چوہڑے میں کوئی برائی نہیں —— تیرے لیئے خاک —— دھول میں کچھ برائی نہیں۔ اس تعلیم اور آزادی نے تیری روح کو گندہ اور ذلیل کر دیا ہے۔ تیرا اخلاق تباہ ہو چکا ہے۔ تو اس خاندان کے لائق نہیں رہا ——

گوبند ۔ چاچا۔ تم ذرا خاموش ہو جاؤ، ناراض مت ہو۔ روی سمجھدار ہے۔ وہ بغیر آپ کی مرضی کچھ نہ کرے گا۔ مجھے ذرا اس سے باتیں کر لینے دو۔

روی تم نے کہاں بات چیت کی ہے؟ کون ہے وہ لڑکی؟

روی ۔ میری طرح اخباروں میں لکھتی ہے، اچھے خاصے گھرانے سے ہے۔

گوبند ۔ مگر ہے کھتری؟

روی ۔ جی ہاں۔

باپ ۔ (گرج کر) مگر بغیر میری اجازت تو نے یہ جرأت کیسے کی؟

گوبند ۔ چاچا تم ذرا خاموش رہو۔ روی اونچ نیچ کو سمجھتا ہے۔ تو کیا وہ بہت

خوبصورت ہے؟

رُوی - جی نہیں، معمولی نقش اور سانولی رنگت کی ہے۔

گوبند - تو کیا اُس کے ماں باپ شادی میں بہت زیادہ دولت دیں گے؟

رُوی - وہ خاصی اچھی حیثیت کے آدمی ہیں، لیکن مَیں جہیز کے لئے وہاں شادی نہیں کر رہا ہوں۔

گوبند - پھر تم وہاں شادی کیوں کرنا چاہتے ہو؟

رُوی - اس لئے کہ مَیں اُسے چاہتا ہوں، وہ مجھے چاہتی ہے مَیں نے وعدہ...

باپ - خاموش، بے حیا، بے غیرت، تُو نے شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ مجھے گُمان بھی نہ تھا مَیں تجھ جیسے نافرمبردار، ننگِ خاندان کا مُنہ دیکھنا چاہتا۔

گوبند - پتاجی - آپ خاموش ہو جایئے ——— ضبط سے کام ———

باپ - بس گوبند - تم الگ ہٹ جاؤ، مجھے روکنے کی کوشش نہ کرو۔ جو خاندان کے نام پر بٹّہ لگانے پر تُلا ہے، مَیں اُس کے ساتھ قطعاً رعایت نہیں برت سکتا۔ میرے گھر میں ایسے کسی آدمی کے لئے جگہ نہیں ہو سکتی۔ اُس نے کس کے ہوتے پر اُس لڑکی سے شادی کا وعدہ کیا؟ یہ ہوتا کون تھا خود بات طے کرنے والا؟ میرے موجود ہوتے ہوئے اس نے مجھے نظر انداز کیا؟

رُوی - لیکن مَیں جانتا تھا، آپ اس بات کی اجازت نہیں دیں گے۔

باپ - اور یہ جانتے بوجھتے تُو نے دانستہ طور پر گستاخی کی؟ تو اس حد تک نڈر، بے باک اور بے دھڑک ہو گیا؟ شہر کی ہوا نے تیرے پر نکال دیئے ہیں۔ بس میرا حُکم ہے کہ اب تم شہر واپس نہ جاؤ گے ——— تم یہیں رہو گے۔

روی ۔ مگر میں نوکری کیسے چھوڑ سکتا ہوں ۔
باپ ۔ کرتے ہو نہ سوا لاکھ کی نوکری ۔ ۶۰ روپلی لاتے ہو ۔ اس سے تین گنی رقم تو
میں اپنے کھیت سے نوکروں میں ہر ماہ تقسیم کرآتا ہوں ۔ اب تک
میں سمجھتا تھا کہ تم کچھ ترقی کرنا چاہتے ہو ـــــــ نوکری کرکے زندگی کا
تجربہ اور علم حاصل کرنا چاہتے ہو ۔ لیکن آج مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ سب
دھوکا تھا ۔ فریب تھا ۔ تم نوکری کے بہانے وہاں آزادی اور عیاشی
کے راستہ پر گمراہ ہو رہے ہو ۔ اب میں تم کو اس لڑکی کے قریب تک
نہ جانے دوں گا ۔ نہ کتا دیکھے گا نہ بھونکے گا ـــــــ
روی ۔ مگر مجھے شہر جانا ہوگا ، میں اپنے وعدے سے نہیں پھر سکتا ۔
ماں ۔ ارے میں کہوں ہوں مان جا ۔ کیوں اپنی اور میری مٹی پلید کرا دے ہے ۔
تو ان کا گسّا جانے ہے چپ ہو جا ـــــــ
باپ ۔ اب کیا چپ ہو گا ۔ ہاتھوں سے تو نکال دیا ، اب کہتی ہے چپ ہو جا ۔
ماں ۔ بیٹے پہ تو پار نہ بساتی ۔ مجھ پہ گھُو بجھل کیوں اتار دیو ؟
باپ ۔ بس خاموش رہو ۔ زبان درازی میں برداشت نہیں کر سکتا ۔ گو بند تم
انکم ٹیکس آفیسر سے مل کر ہاں کر دو ۔ ہم اسی مہینے شادی کریں گے ۔
روی ۔ (اعتراض کے لہجہ میں) چاچا جی ۔
باپ ۔ تمہیں کہنے کی ضرورت نہ ہوگی ۔ لڑکی تم کو دکھا دی جائے گی ۔
روی ۔ مگر میں اب کوئی لڑکی دیکھنا نہیں چاہتا ۔
باپ ۔ روی ، تم ہمارے مزاج سے واقف ہو ۔ تمہارے پیر میں اب ہمارے برابر
کی جوتی آنے لگی ہے ۔ ہم اب تم کو بیٹے کے طور پر نہیں ، بلکہ ایک دوست
کی حیثیت سے استعمال کرنا چاہتے ہیں ۔ جانور کو مار کر سیدھا کیا جاتا

ہے مگر عقلمند آدمی کے لیئے اشارہ کافی ہوتا ہے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ اب
اس بات کی ضرورت رہ گئی ہے کہ ہم تم کو بچپن کی طرح مار کر اور گھر سے باہر
نکال کر راہِ راست پہ لائیں۔

ردی۔ لیکن میں غلط راستے پر تو نہیں چل رہا۔

باپ۔ تم غلط راستے پر نہیں چل رہے؟ تم میری نسل کا خون مخلوط کرنا چاہتے ہو۔
بھارت دوارج رشی کے پاکیزہ برہمنی خون کو ایک نیچی ذات کے خون سے
گندہ کرنا چاہتے ہو۔ تم آم کے پیڑ پر نیم کی قلم چڑھا کر میری نسل کے پھل
کو کڑوا کرنا چاہتے ہو؟ اور کہتے ہو، غلط راستے پر نہیں چل رہا۔ یاد رکھو
میں تمہیں ایسا ہرگز نہ کرنے دوں گا۔ میں تمہارا باپ ضرور ہوں، مگر اپنے
خاندان کے خون اور اپنی نسل کی پاکیزگی برقرار رکھنا میرا پہلا فرض ہے۔

ردی۔ چاچاجی میں آپ سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔ مگر میں اتنا ضرور کہوں گا کہ میں
آدمی آدمی میں محض پیدائش اور ذات کی بنا پہ فرق کرنے کو تیار نہیں
ہوں۔ نہ برہمن آم کا پیڑ ہے اور نہ دوسری ذات کے لوگ نیم کے
درخت۔ سب کا خون یکساں طور پہ پاکیزہ ہے۔ خون صرف بیمار کا خراب
ہوتا ہے۔

باپ۔ اوہ عشق نے تمہاری عقل کو اس طرح بھرشٹ کر دیا۔ کتابی علم اور سیاسی
لیڈروں کے لیکچروں نے تمہارا ذہنی توازن اس حد تک خراب کر دیا۔
تم اتنے نیچے گر گئے، کہ ایک برہمن خاندان میں جنم لینے کا فخر بھی محسوس
نہیں کر سکتے؟ مجھے سخت افسوس ہے کہ میرے گھر میں ایسی اولاد پیدا
ہوئی۔ لیکن یاد رکھو، میں نے زندگی بھر دنیا کو اپنے راستے پر چلایا ہے۔
اس کے بتائے راستے پر نہیں چلا ہوں۔ تم بھی اس ارادے میں

کامیاب نہ ہو سکو گے۔ اس لئے تم کو حکم دیتا ہوں کہ تم شہر نہیں جاؤ گے۔

رودی ۔ لیکن میں مجبور ہوں۔ مجھے شہر جانا ہوگا۔

باپ ۔ (گرج کر) رودی ——

گوبند ۔ پتاجی۔ یہ کیا کہہ رہا ہے رودی —— تو پتاجی کا غصہ اچھی طرح جانتا ہے۔ نادان نہ بن —— آپ خاموش ہو جائیے، چاچا جی۔ میں رودی کو منا لوں گا۔ آپ ذرا بیٹھک میں چلے جائیے۔

باپ ۔ چلا جاتا ہوں۔ لیکن گوبند سب لوگ کان کھول کر سن لو۔ یہ گھر میرا ہے۔ یہاں صرف ایک آدمی ہے، اور اسی کی چلتی ہے۔ میں نے ہر اُس آدمی کا سر کچل دیا ہے، جس نے میرے خلاف بغاوت کی ہے۔ میں نرمی اور محبت کا قائل ضرور ہوں، مگر صرف ایک حد تک۔ بھائی، بیوی، بیٹا، بیٹی سب اس حد تک مجھ سے فیض اُٹھا سکتے ہیں، جس حد تک کہ وہ میرے اقتدار کو سمجھتے ہیں اور میرے بتائے راستے پر چلتے ہیں۔ بہکے ہوئے قدموں اور سرکش نگاہوں کو میرے گھر میں پناہ نہیں مل سکتی ——

* * * * * * * * * * *

(دوسرا منظر)

بھابی ۔ لالہ جی۔ مان جاؤ۔ اس بات کو دل سے نکال دو۔

کملا ۔ بھیا، یہ تم نے کیا سوچا ہے۔ ذرا سوچو تو۔ ہم نے کیا کیا آس لگا رکھی تھیں۔ ہمارے کیا کیا ارمان تھے۔ ہم نے تم پر ہی من رکھا تھا۔

رودی ۔ کملا، تم بھی ایسی باتیں کرتی ہو؟ آخر کون سی بات ہے، جو تم سب لوگ اس قدر گھبرا گئے ہو، حوصلہ چھوڑ بیٹھے ہو، نا اُمید ہو گئے ہو۔ میں ایک کھتری لڑکی سے شادی کر رہا ہوں، تم لوگوں کے حق سے تو انکار نہیں کر

رہا۔ تم لوگوں سے دُور تو نہیں ہو رہا۔

ماں - یہ دُور ہونے کا راستہ نہیں تو اور کیا ہے؟ شادی کرنے کے بعد بھلا وہ تجھے گھر میں گھسنے دیں گے؟ انہوں نے صاف کہہ دیا کہ میں گھر کے ہر آدمی کو ایک ایک موقعہ دینا ہوں۔ اگر اُس کے بعد بھی وہ اپنے ارادے سے باز نہ آیا، تو پھر اُس کا اِس گھر سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ (رو کر) ردی میرے بڑھاپے کا خیال کر۔ میں نے ساری زندگی پاپڑ بیلے ہیں۔ اب تو مجھے کچھ سُکھ بھوگ لینے دے بیٹا ——

بھابی - لالہ جی، تم اماں جی کا خیال کرو۔ آخر ایسی کونسی بات ہے۔ اُس لڑکی میں جو تم اُسے نہیں چھوڑ سکتے ہو؟ میں تمہیں اُس سے اچھی، خوبصورت اور قابل لڑکی دِلا سکتی ہوں۔ مگر ایسا کام نہ کرو، جس سے کُل کو داغ لگے۔

ردی - اِس شادی سے کُل کو داغ لگے گا؟ تم اِس کو اتنی بُری بات خیال کرتی ہو؟

کملا - ہاں تم ہی بتاؤ، نکو بننا، دُنیا سے ہٹ کر چلنا کونسی اچھی بات ہے؟ اور تم اچھے بُرے کی مت سوچو۔ صرف یہ سوچو، کہ آج ماں، چاچا جی کے دل پہ کیا بیت رہی ہے۔ انہوں نے تمہاری شادی کے کیا کیا سپنے دیکھے تھے۔ ماں اسی آس میں بوڑھی ہوگئی کہ اس کا بیٹا گھوڑی پہ چڑھ کے ڈیوڑھی سے نکلے گا۔ ہم بھابی کا منہ دیکھنے کو آج تک ترستے ہیں۔ لیکن اب تم بیاہ کرنے پر تیار ہوئے تو کھتری ذات میں کر رہے ہو۔ کیا یہاں رہ کر تمہاری شادی ہو سکتی ہے؟ کیا کوئی برادری والا آکر پھٹکے گا؟ وہ ہمارے گھر کے چھوٹے ہوئے بیر بھی نہ کھائیں گے ——

ردی - وہ لوگ نہ آئیں تو نہ آئیں۔ میں اُن کی پرواہ نہیں کرتا۔ مجھے ان لوگوں سے نفرت ہے ——

ماں۔ ہاں، تجھے تو اُن کی پرواہ نہیں، تو شہر میں رہتا ہے نا۔ جنم تو ہمارا خراب کرنا چاہتا ہے۔ تو تو بیاہ رچا کے بیٹھ جائے گا۔ ہنسی خوشی رہے گا۔ مُنہ نہ دِکھلانے کے قابل تو ہم ہو جائیں گے۔ برادری مُنہ لے کے بولنے بھی نہ دے گی۔ کوئی تیرے چاچا کو حُقّہ تک نہ دے گا۔

کملا۔ ماں، تُو تو گھر میں بیٹھ کر عورتوں کے طعنوں سے بچ جائے گی۔ لیکن میرا۔ میرا کیا ہوگا ماں۔ میری ساس نندیں تو مجھے توڑ توڑ کے کھا جائیں گی۔ بھیّا کچھ تو خیال کرو۔ میری زندگی ویسے ہی خراب ہے۔ بات بات پر ساس، نندیں، جیٹھانیاں طعنے دیتی ہیں۔ اگر تم نے کچھ ایسا کر لیا تو میرا تو مرن ہو جائے گا۔ مَیں تو پھر تمہارا نام تک نہ لے سکوں گی۔ (رو پڑتی ہے)۔

بھابی۔ رَومت بی بی جی، رُومت۔ لالہ جی مان جاؤ۔ ہم سب کی خاطر مان جاؤ۔ دیکھو سارا گھر بھر دُکھی ہے۔ سب کی بھوک پیاس مر گئی ہے۔ چھوٹی موٹی بات ہوتی، تو ہم مان جاتے۔ تمہارے بھیّا کو مَیں منا لیتی، پر یہ تو سارا کا معاملہ ہے۔ تمہارے بھیّا کے آگے یہ پانچ لڑکیاں ہیں۔ وہ چار سال بعد ان کے بیاہ کی فکر پڑنے لگے گی ــــــ تم اپنی لڑکیوں کو جات سے بے جات دے دو گے۔ لیکن تمہارے بھیّا کیا کریں گے؟ تمہاری بھتیجیوں کو کوئی براہمن قبول نہ کرے گا کسی کی خاطر نہ سہی اُن کی خاطر ہی مان جاؤ، مَیں تمہارے پیر پڑتی ہوں۔

باپ۔ (باہر سے آ کر) بہو، یہ ظالم اور جلّاد ہے، یہ کسی کی خاطر نہیں مانے گا۔ ہٹ جاؤ تم اِس کے پاس سے۔ یہ اس قابل نہیں کہ تمہارے پاس بیٹھ سکے ــــــ اس کی رُوح پتت ہو چکی ہے۔ یہ نالی کا کیڑا بن کر رہنا

چاہتا ہے۔ اسے اب سنگھاسن کی ضرورت نہیں۔

ماں ۔ (کھڑی ہو کر اور بیچ میں آکر) تم ذرا چُپ بھی رہو ——— یہ مان جائے گا۔ اپنی بھابی اور بہن کی بات مان جائے گا ———

باپ ۔ یہ اگر ایسا غیرت مند ہوتا تو اپنی ماں کے برابر رُتبہ رکھنے والی بھابی سے پیر پکڑوانے کے بجائے خود اُس کے قدموں میں گر جاتا ؟ یہ خاندان میں ایک سانپ گھس آیا ہے۔ یہ کسی کی محبت اور رحم کا مُستحق نہیں ہے ——— کھڑے ہو جاؤ تم ۔ کھڑے ہو جاؤ ، اور نکل جاؤ ، اسی وقت گھر سے۔ مُنہ نہ دکھانا پھر کبھی اپنا ۔ نکل جاؤ ۔

کملا ۔ (روکتے ہوئے) چاچا جی ۔

باپ ۔ کھڑے کیوں ہو ؟ دُور ہو جاؤ ، اس منحوس صُورت کو لے کر ۔

بھابی ۔ ماں جی ، ذرا ان کے بڑے بھیا کو بُلا لو ۔ وہ چاچا جی کو لے جائیں گے ۔ ماں جی ، تم چاچا جی کو روک لو ———

باپ ۔ بہو ، تم اندر جا کر بیٹھو ۔ ہم جانتے ہیں ، تم میں وہ خوبیاں ہیں ، جو اُونچے گھرانوں کی بیٹیوں میں ہوتی ہیں ۔ ہماری آتما تمہیں دُعا دیتی ہے ۔ لیکن اس زہری اور نالائق کی حمایت نہ کرو ۔ یہ خاندان کے لئے ایک خطرہ بن گیا ہے ۔ اِس خطرہ کو دُور کرنا ہو گا ۔

ماں ۔ لیکن اِسے سوچنے دو ، دو گھڑی رُک جاؤ ۔ صبح سے کچھ کھایا نہیں ۔ کھانا تو کھا لینے دو ۔ پھر لڑ لینا ۔

باپ ۔ ایک طرف ہٹ جاؤ ۔ تیری محبت ہی نے تو اِسکو تباہ کر کے رکھ دیا ہے ۔

ماں ۔ چلو سارا قصور میرا ہی سہی ، پر ذرا ٹھہر جاؤ ۔ یہ مان جائے گا ۔

باپ ۔ یہ کبھی نہیں مانے گا ، یہ میری ناک کٹا کے رہے گا ۔ مگر مَیں بھی اسے جڑ سے

کاٹ کر پھینک نہ دوں. تو برہم ونش سے نہیں۔ نکل جاؤ میرے گھر سے۔

ماں ۔ (سامنے ڈٹ کر) یہ نہیں جائے گا بھو کا پیاسا اِس گھر سے۔

کملا ۔ (روتے لہجہ میں) ماں، تم یہ کیا کر رہی ہو۔ چاچا کی آنکھیں دیکھو۔

باپ ۔ کملا۔ اپنی ماں کو ہٹالے، مَیں بہو بیٹی کے سامنے اسے ہاتھ نہیں لگانا چاہتا۔

روی ۔ آپ کو اِس کی ضرورت نہ ہوگی۔ مَیں خود چلا جاؤں گا۔

ماں ۔ نہیں، نہیں۔ تو نہیں جائے گا۔ میرے جیتے جی، تو اِس گھر سے بھو کا پیاسا نہیں جائے گا ——— (رو پڑتی ہے) مَیں سر پھوڑ کر مر جاؤنگی۔

روی ۔ ماں۔ تم درمیان میں نہ آؤ، مجھے جانے دو۔ مَیں تمہاری محبّت کے اِن آنسوؤں کو کبھی نہ بھولوں گا۔ مجھے جانے دو ———

ماں ۔ نہیں نہیں، تو نہیں جائے گا۔ جو مجھے کندھا دے کر اس گھر سے گنگا گھاٹ پہنچاتا، وہ اس گھر سے بھو کا پیاسا نہیں جائے گا۔ نہیں جائے گا۔

کملا ۔ بھیّا مان جاؤ، ماں کا جنم خراب نہ کرو۔

بھابی ۔ لالہ جی۔ تم کو اپنے پانچوں بھتیجیوں کی قسم، تم کو ماں جی کی . . . .

روی ۔ بھابی، آگے قسم نہ دلانا۔ مَیں جس سے وعدہ کر چکا ہوں، اُسے توڑنا اپنی ماں، بہن، بھابی ہی کا اپمان کرنا ہوگا۔ تم سب کا حق مَیں اب اِسی طرح ادا کر سکتا ہوں. کہ اُس سے شادی کر لوں، جو تمہاری طرح ایک عورت ہے اور جس کی عزّت تمہاری عزّت کی طرح بیش قیمت ہے۔

باپ ۔ لیکن اگر تجھے اس کی عزّت کا اتنا ہی پاس ہے تو اتنا بے غیرت کیوں ہے۔ کہ میرے گھر میں اب تک کھڑا ہے، نکل جاؤ اِسی لمحہ ———

ماں - نہیں، یہ نہیں جائے گا، اور یہ اگر گیا، تو اس کے ساتھ میری لاش جائیگی -

باپ - تو تو اس کا ساتھ دینا چاہتی ہے ؟

ماں - ہاں - میں اپنے بیٹے کو نہیں چھوڑوں گی - یہ بھوکا رہے اور میں پیٹ بھر کے پانی پیوں -

باپ - تو تو بھی اس کے ساتھ جا سکتی ہے - پھر میرے گھر میں تیرے لئے بھی جگہ نہیں -

کملا - (لرز کر) چاچاجی -

بھابی - چاچاجی، میں آپ کے پاؤں پکڑتی ہوں -

باپ - یہ کیا کرتی ہو بہو - میں کسی شخص کو بھی تیرے یا تیری لڑکیوں کے لئے کانٹے نہیں بونے دوں گا - (بیوی سے) تو تجھے بیٹے کے ساتھ جانا منظور ہے ؟

ماں - ہاں -

ردی - نہیں ماں - تم میرے ساتھ نہیں جا سکتیں - میں تم کو گھر کے سب لوگوں سے جدا کر کے میں تمہاری خوشی ختم کرنا نہیں چاہتا - اس لڑکی سے میں نے وعدہ کیا ہے - اس لئے گھر کی خوشی سے محروم ہونے کی سزا کا حقدار صرف میں ہی ہوں - اس لئے میں اکیلا جاؤں گا - اپنے ساتھ کسی کو نہیں لے جاؤں گا - میں جاتا ہوں -

باپ - ٹھہرو - ایک آخری رشتہ اور ختم کر لینے دو - تم نے اپنی نوکری کے درمیان میں جو کچھ مجھے دیا ہے میں اس سے تمہیں محروم نہیں کروں گا - تم اپنے روپے لیتے جاؤ -

ردی - مجھے روپوں کی ضرورت نہیں چاچاجی - صرف دعا دیجئے کہ جس طرح آپ اپنے اصول پر ثابت قدم ہیں، میں بھی اپنے اصول پر ثابت قدم رہ

سکوں ۔ (چلا جاتا ہے)
ماں ۔ (چیخ کر) ریبو ۔ (گر پڑتی ہے)

پردہ گر جاتا ہے

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

دوسرا منظر

ماں ۔ آج بھی خط نہیں آیا تیرے اسکول کے پتے پر ؟
کیشو ۔ نہیں ماں ــــ آج تو میں اسکول کے ہیڈ ماسٹر سے پوچھ آیا کہ میرا کوئی خط آیا ۔ بھیا کا کوئی خط نہیں آیا ۔ ایک خط اور ڈال دوں کیا ؟

(باپ کی کھانسی سُنا دیتی ہے)

کیشو ۔ ماں چُپ ۔ چاچا جی آرہے ہیں ۔
باپ ۔ (اندر آکر) کیشو ، دیکھو یہ خربوزے لایا ہوں ۔ انہیں بالٹی میں ڈال دو ۔ تیسرے پہر تک ٹھنڈے ہو جائیں گے ۔
کیشو ۔ بہت اچھا جی ۔
باپ ۔ ہاں بھئی ۔ آج دوپہر کیا بنانے کا ارادہ ہے ؟
ماں ۔ جو تم کہو ۔
باپ ہر بات کو میں ہی کہوں ؟ گھر میں اور کوئی کہنے والا ہی نہ رہا ؟
ماں ۔ تم نے کہنے کس کو دیا ہے ۔ یہ گھر حکم سے تمہارے چلتا ہے ۔
باپ ۔ دیکھو ، آج تو نے پھر لڑنے کی ٹھان رکھی معلوم ہوتی ہے ۔
ماں ۔ میں لڑنے کی کیا ٹھانوں گی ! جب بیٹا گیا ، تب ہی چھاتی پر پتھر رکھ کر چُپ ہو گئی ، تو اب کیا لڑوں گی ۔

باپ۔ مَیں نے کیا تجھے روکا تھا۔
ماں۔ تم نے مجھے روکا ہی کب تھا، تم تو سدا مجھے گھر سے نکالنے کی دھمکی دی ہے۔ وہ تو مَیں ہی تھی جو اپنے باپ کی لاج کو پچی ــــــ لات، دھکے کھائے، پر دہلیز سے باہر پیر نہ دیا۔ تم نے میرے ساتھ کون سی کسر چھوڑی ہے۔
باپ۔ دیکھو۔ مجھے یہ پسند نہیں کہ تو لیتی ہے ایک بات اور جا پہنچی ہے دُوسری پر۔ قصُور بیٹے کا اور الزام مجھ پر دھرتی ہے۔ بیٹے کو اگر تیرا موہ ہوتا، تو گھر سے کیوں جاتا، آج اُسے چھ مہینے ہو گئے گھر سے نکلے۔ ایک دفعہ بھی اپنی ماں کو دیکھنے کے لئے آ کر نہ جھانکا ــــــ
ماں۔ تم آنے دو ہو نا اُسے۔
باپ۔ مَیں نے تو پہرے دار بٹھا رکھے ہیں دروازے پر۔
ماں۔ تمہاری نگاہ سو پہرہ داروں کے برابر ہے۔ جانتا ہے وہ، کہ اگر تمہیں اُس کے آنے کا پتہ چل گیا تو مجھے چٹیا سے پکڑ کر گھر کے باہر کھڑی کر دوگے۔ وہ تو اس عمر میں میری مٹّی خراب کرانا نا چاہوے ہے۔
باپ۔ ارے مجھے دھوکہ دیتی ہے؟ میرے سر الزام منڈھتی ہے؟ اگر اُسے آنا ہوتا، تو کیا آنے سے رُک جاتا؟ اور تُو سمجھتی ہے کہ مجھے کچھ نہیں معلوم؟ مجھے سب معلوم ہے کہ تیرے پاس اُس کے خفیہ طور پر خط آتے ہیں۔
ماں۔ میرے پاس؟ مَیں پڑھی لکھی ہُوں نا؟
باپ۔ مگر تیرا یہ بیٹا تو پڑھا لکھا ہے۔ مَیں سب جانتا ہُوں۔ بیٹا اپنی ماں کی طرف ہی جُھکتا ہے۔ جس دن تیرے پاس اس کا خط آتا ہے، مَیں تیرے چہرے کو دیکھ کر بھانپ جاتا ہُوں۔ اُس دن تیرے چہرے پر عجیب کیفیت ہوتی

ہے۔ سُوکھے کھیت ہیں جیسے پھالر پڑ جاتی ہے۔ تو بولتی کچھ نہیں، پر تیرا رواں رواں بُوٹوں کی طرح کھِل اُٹھتا ہے۔ اس گھر میں ظالم تو مَیں ہوں ——— بیٹے بیٹیوں کی ضرورت مجھے ہی نہیں۔

ماں۔ ہاں تمہیں ہی نہیں۔ تمہیں ان کی کبھی ضرورت نہ رہی ——— جب وہ چھوٹے بچے تو تم نے اُنہیں گود میں لے کر نہیں کھلایا۔ رات کو وہ روئے تو تم نے اُن کی چار پائیاں اُلٹ دیں اور اُنہیں زمین پر ٹپک دیا۔ اُن کو تم نے کبھی اپنی روٹی میں سے توڑ کر ٹکڑا نہیں دیا۔ بڑے ہوئے تو سوائے لال لال آنکھیں دِکھانے کے تم نے انہیں پیار سے نہیں بُلایا۔ اور جب انہوں نے کوئی غلطی کی تو تم نے اُن کو گھر سے نکال دیا۔

باپ۔ میرا دل پتھر کا ہے نا؟

ماں۔ پتھر کا نہیں، لوہے کا، بلکہ لوہا بھی آگ سے پگھل جاتا ہے۔ پر تم۔ ۔ ۔ ۔

باپ۔ پر مَیں نہیں پگھلتا۔ آج گھر میں سب سے زیادہ ظالم، سنگدِل، جلّاد مَیں ہی ہوں، کسی دُوسرے میں کوئی قصور نہیں۔ نہ تجھ میں نہ تیری اولاد میں۔ میں نے کتنی محنت اور تکلیف سے روپیہ کمایا۔ اپنے اُوپر کتنی سختی اور جبر کرکے دولت جمع کی۔ اولادوں کے لیئے مکان دُکان کھڑے کیئے۔ انہیں پڑھا لکھا کر قابل بنایا۔ ان کا کوئی حساب نہیں، مَیں بھی دُنیا کے باپوں کی طرح عیش کر سکتا تھا۔ جو کچھ کماتا سب کچھ پھُونک کر رنگ رلیاں منا سکتا تھا۔ ظاہری شان اور ظاہری محبت دِکھا کر اولاد کے مزاج بگاڑتا اور قرضدار ہو کر مر سکتا تھا۔ لیکن مَیں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ مَیں جانتا تھا کہ لوہا تپانے سے، اور چوٹیں لگانے سے ہی مضبوط ہوتا ہے اور جو باپ اپنی اولاد کو تپا کر اور سختی کرکے فولاد کی طرح مضبوط نہیں بناتا، وہ اُن کے ساتھ اور

بھگوان کے ساتھ ایک جُرم کرتا ہے۔

ماں - پر تم نے یہ تو سوچا ہوتا کہ مَیں ماں ہُوں۔ میرا کلیجہ پتھر کا نہیں ہو سکتا۔
مَیں جیتے جی کیسے اپنے ہاڈ ماس کے ٹکڑوں سے علیحدہ رہ سکتی ہوں۔
بِنا دریا کا بچہ مر جاتا ہے تو وہ کبھی چھ مہینے تک اُسے چھاتی سے لگائے
پھرتی ہے۔ بچھڑے کو کوٹھڑی میں باندھ دُوں ہُوں، اور وہ
گائے کو دکھائی نہ دیتا، تو وہ رمبھا رمبھا کر باؤلی ہو جاتی ہے۔ پھر
مَیں کیسے صبر کرُوں؟

باپ - اور مَیں؟ تجھے تو ملال ہوتا ہی نہیں نا؟ مجھے تو اپنا بیٹا یاد آتا
ہی نہیں، لیکن تُو تو کہہ چکی ہے کہ مَیں نے کبھی بیٹے بیٹی کے لئے محبت
نہیں دکھائی۔ ٹھیک ہے۔ اِس جنم میں مَیں تجھے اپنی حالت محسوس نہ کرا
سکوں گا۔ لیکن کاش اگلے جنم میں تُو باپ بنے اور پھر محسوس کرے کہ
خاندان کی عزت اور اولاد کی بہبودی کا خیال اُسے کیا کیا کرنے پر مجبور کر
دیتا ہے ـــــــــ

(باپ چلا جاتا ہے، مکان کے پچھلے دروازہ پر دستک
سُنائی دیتی ہے۔ کیشو اُٹھ کر دروازہ کھولتا ہے۔ رُوپی اندر
داخل ہوتا ہے۔ اس کے کپڑے میلے ہیں اور داڑھی بڑھی ہے)

رُوپی - ماں۔

ماں - میرے بیٹے، میرے ریپو۔ یہ تُو نے اپنا کیا حال کر لیا؟

رُوپی - کچھ نہیں ماں۔ کچھ نہیں۔ ماں مجھے معاف کر دے۔ مَیں نے تجھے بڑا دکھ
دیا ہے۔ مَیں تیری محبت کے لائق نہیں ہوں۔ مَیں نے تیرے دُودھ کا
حق ادا نہیں کیا۔

ماں - پر مجھے کچھ نہیں چاہیئے ریبو - مجھے کسی سے کچھ نہیں لینا - تم سُکھی رہو - پُھولو، پھلو - یہی دیکھتے ہوئے میری آنکھیں مُند جائیں -

روی - ایسی باتیں مت کہو ماں - تمہیں ابھی بہت برس جینا ہے -

ماں - بس، اب میں بہت دن نہیں جیؤں گی ریبو - میرے مدمہ بیٹھ گیا ہے - تینوں بیٹوں میں سے میں نے تجھے ہی اپنے بڑھاپے کی لاٹھی سمجھا تھا - مگر - تو تو میرے ہوتے ہُوئے ہی اس گھر میں غیر ہو گیا ہے - تو باہر پردیس میں جانے کیوں کا رہے ہے، جانے پیاسا ہے، اور میں اِس گھر میں پیٹ بھر کے کھاؤں اور سو رہوں - کوئی ڈائن ماں ہوگی جو ایسے کھا کے سو رہے گی - دیکھ تو میرا کیا حال ہو گیا - بس ایک تار رہ گیا ہے - کسی دن یہ کبھی ٹوٹ جائے گا -

روی - ماں - میری ماں - مجھے معاف کر دے - مجھ سے یہ باتیں نہ کہہ، ورنہ میرا کلیجہ پھٹ جائے گا - میری آتما میں ویسے ہی وقت ایک کانٹا سا چبھتا رہتا ہے - میں راتوں کو سو نہیں سکتا - تیرے ساتھ بے انصافی کا خیال مجھے ہر وقت ڈستا رہتا ہے - لیکن میں کیا کروں؟ میں ایک عورت کو دھوکہ دے کر تیری پوجا نہیں کر سکتا، کیونکہ میں اپنی ماں پر گنگا جل کے بجائے ایک دُوسری عورت کا خون نہیں چڑھانا چاہتا - میری آتما کانپتی ہے اس تصوّر سے ——

ماں - تو پھر اس سے بیاہ کر لے، اپنے کو مت جلا، اس کو مت ترسا -

روی - پر تمہاری خوشی، تمہارے ارمان؛ ماں یہ نہیں ہو سکتا کہ میں دونوں بچوں نبھا سکوں، میرا دھرم بچ جائے اور کسی کی آنکھ میں آنسو نہ آئے؟ ماں، اس لڑکی کے ساتھ کیا میں تم کو بھی خوش نہیں کر سکتا؟

ماں ۔ میری خوشی تو ختم ہو گئی ریئو۔ سُکھ میرے کرم میں لکھا ہی نہیں۔ سارے جنم تیرے چاچا کی جُوتیاں سہیں۔ اولاد ہوئی، سوچا آخری عُمر میں سُکھ بھوگوں گی، سو وہ بھی چھن گیا۔ مجھے تو اب چتا کی لکڑیوں ہی میں سُکھ ملے گا۔

روی ۔ ماں۔

ماں ۔ ہاں ریئو۔ اس میں تیرا دوش نہیں۔ تجھے ہی کونسا سُکھ نصیب ہُوا ہے۔ جب سُکھ ملے گا، دیکھا جائے گا۔ ابھی تو تیرے ماں باپ کے لاڈ پیار تلے رہنے کے دن تھے ــــــــ

روی ۔ تو کیا چاچا جی نہیں مان سکتے ماں؟ کیا وہ کسی طرح بھی میری شادی اپنے ہاتھ سے نہیں کر سکتے؟ مَیں پانچ دس سال تک رُک سکتا ہوں ماں؟

ماں ۔ ارے ریئو۔ پاگل ہُوا ہے۔ یہ بات کبھی نہ ہونے کی ہے۔ اس کے آسرے مت بیٹھا رہ۔ تیرے چاچا کبھی نہ مانیں گے۔ سب نے کہہ کر دیکھ لیا، پر وہ نہیں مانتے۔ دن رات گھر میں کلیش رہتا ہے۔ اب جو کچھ تجھے کرنا ہے کر ڈال۔ جب تک تو شادی نہیں کرے گا، گھر کا کلیش ختم نہیں ہو گا۔ اب کب تک میری جان کو مصیبت میں ڈالے رہے گا۔ دیکھو اگر زیادہ دن یُوں ہی رہا تو مَیں بیٹھی بیٹھی چھن میں اُڑ جاؤں گی، اور تُو روتا ہی رہ جائیگا۔

روی ۔ اچھا ماں، اچھا۔ مَیں اب جلتے ہی بیاہ کر لُوں گا۔ مگر تو مجھے معاف کر دے۔

ماں ۔ کیا معاف کر دوں! مَیں اپنی آتما کو کس طرح کچل ڈالوں۔ تو بیاہ کرے گا اور مَیں یہاں کوٹھڑی میں منہ ڈھے پڑی رہوں گی؟ سب کے ہوتے تیرے کوئی ہلدی تیل ملنے والا نہ ہو گا! تیرے گھوڑی پہ چڑھتے وقت کوئی بنّے بھی نہ گائے گا! ریئو، جس دن تیرا بیاہ ہو گا، میرا کلیجہ ٹوٹ جائیگا۔

(کھانسنے کی آواز)

کیشو۔ ماں، ماں۔ شائد چاچا جی لوٹ آئے ہیں۔

روی۔ کہاں؟ کیا وہ بازار سے آ گئے؟ ماں میں جاتا ہوں۔

ماں۔ ہاں جا۔ یہ میرے پھوٹے بھاگ ہیں کہ اپنے بیٹے سے بھی چوروں کی طرح ملتی ہوں۔ (رو پڑتی ہے)

روی۔ ماں رو مت۔ میرا راستہ مشکل نہ بنا۔ ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔

ماں۔ اچھا، اچھا۔ جا۔ پر ٹھہر۔ یہ میرے گلے کی مالا لیتا جا۔ اپنی بہو کو پہنا دیجیو۔ کہیو، تیری اس ابھاگی ساس نے دی ہے، جس کے بھاگ میں اپنی بہو کا منہ دیکھنا بھی نہیں لکھا ہے۔ رو پڑتی ہے۔

(روی پاؤں چھوتا ہے۔ اور مکان کے پچھلے دروازہ کی طرف بڑھتا ہے پردہ گرتا ہے۔)

❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖

وہی منظر

(رات کا اندھیرا ہے۔ اس اندھیرے میں دو چارپائیاں نظر آتی ہیں)

باپ۔ سو گئی (خاموشی) میں نے کہا سو گئی (خاموشی) دیکھو میں کہتا ہوں کہ مجھے پریشان نہ کر۔

ماں۔ میں تم سے کیا کہہ رہی ہوں۔

باپ۔ تو پھر تو کیسے پڑی ہے؟

ماں۔ نیند آ رہی ہے۔

باپ۔ اور کھانا کیوں نہیں کھایا؟

ماں۔ بھوک نہیں لگی۔

باپ ۔ دیکھ تُو مجھ سے مت چھپا۔ آج صبح سے تو ٹوٹی ٹوٹی ہو رہی ہے ــــــ کیا روی بیمار ہے ؟

روی مجھے کچھ پتہ نہیں۔ مجھے مت چھیڑو۔ مجھے سونے دو۔

باپ ۔ تو سو نہیں رہی ہے، تُو اپنا کلیجہ مسوس رہی ہے۔ تیرا سارا جسم مڑا جا رہا ہے۔ کیوں، میری زندگی خراب کر رہی ہے۔

ماں ۔ مَیں تم سے کیا کہہ رہی ہوں ؟ تم مجھے مُنہ دیکھ ایک کونے میں پڑنے بھی کیوں نہیں دیتے ؟ مجھے زیادہ کہو گے تو مَیں کہیں مُنہ کالا کر کے چلی جاؤں گی۔ کنوئیں میں ڈوب مرونگی۔

باپ ۔ یہ مَیں جانتا ہوں کہ تو اب مرنے کو پھر رہی ہے۔ اب تُو بھی میرا ساتھ چھوڑنا چاہتی ہے ــــــ

ماں ۔ مَیں ؟ ۔ مَیں چھوڑوں گی تمہارا ساتھ ؟ تم کہہ دو اپنے کلیجہ پر ہاتھ رکھ کے کہ مَیں تمہارا ساتھ چھوڑنا چاہتی ہوں۔ مَیں نے اپنی ساری زندگی تمہارے ساتھ ختم کر دی۔ جس نے تمہارے لئے اپنا بیٹا تک چھوڑ دیا، تم اس کے لئے ایسے بول بولتے ہو ؟ مت کرو میرا کلیجہ چھلنی۔ مَیں ویسے ہی مر رہی ہُوں۔

باپ ۔ مَیں تجھے مارنا چاہتا ہوں ؟ تو بھی اِس عمر میں آکر مجھ سے یہی کہتی ہے ؟ ساری عمر میرے ساتھ رہ کر بھی تُو نے مجھے اِتنا ہی سمجھا ہے ؟ تجھے مار کر مَیں کس کے لئے جیئوں گا ! میرے لئے یہاں اب کون رہ گیا ہے !

ماں ۔ تمہارے لئے ؟ تمہارے لئے سب کچھ رہ گیا ہے، نہیں رہا تو میرے لئے نہیں رہا۔ میرا بیٹا کل بیاہ کرے اور مَیں یہاں ......

باپ ۔ کیا ؟ کیا روی کل بیاہ کر رہا ہے ؟ تجھے کس نے کہا ؟

(خاموشی)

مَیں سمجھ گیا۔ تیرے پاس خط آیا ہے۔ تُو نے مجھے بتایا بھی نہیں ؟

ماں ۔ بس بس رہنے دو۔ میرے چھالے مت چھوڑو۔ جو تمہیں یہ جاننے کا چاؤ ہوتا، اسکی خوشی ہوتی، اُمنگ ہوتی تو میرا بیٹا میرے گھر سے کیوں نکلتا۔ آج کے دن وہ بے ماں کے لاڈلے کی طرح کیوں بنا ہلدی تیل رہتا ؟ کیوں اس کے ہاتھ میں کنگنا نہ بندھتا ؟ کیوں آج میری ڈیوڑھی سونی ہوتی ؟ کیوں آج مَیں آنسو پی پی کر آتما کو مسوس رہی ہوتی ——

باپ ۔ اور یہ سب کچھ میری وجہ سے ہُوا ؟ قصور وار میں ہی ہوں ؟

ماں ۔ ہاں تم۔ تم نے ہی سب کچھ کیا۔ تم نے ہی میری ساری خوشی ختم کر دی۔ دُنیا میں ایسے بیاہ ہوتے ہیں۔ دُنیا غیر ذات میں شادیاں کرتی ہے۔ تم آج تک دُنیا سے لڑتے آئے ہو، لوگوں کو ٹھکراتے آئے ہو۔ لیکن اس کام کے لئے، اپنے بیٹے کی شادی کے لئے، تم نہ لڑ سکے۔ تم نے اُسے گھر سے نکال دیا ——

باپ ۔ مجھے شوق تھا، بیٹے کو گھر سے نکالنے کا —— مَیں چاہتا تھا کہ میرا بیٹا ایک یتیم اور لاوارث کی طرح اکیلا شادی کرنے جائے۔ تو اپنے دل سے کہتی ہے یہ بات ؟

ماں ۔ یہ تمہیں تھا تو اور کیا تھا ؟ تم دُنیا سے ٹکر لے سکتے تھے۔ ہمارے بیٹے کو اور کوئی بیٹی نہیں ملتی۔ پڑنیوں کے بیاہ ابھی کس نے دیکھے۔ جس کی ناک پے چاندی کا جوتہ مارتے، وہ ان کو بیاہ لے جاتا۔ لیکن اس بڑھاپے میں بھی تمہاری ہٹ دھرمی اور برادری کا پنچ چودھری بنا رہنے کی چاہ کم نہ ہوئی۔ تمہیں بیٹے سے زیادہ اپنی ہٹ پیاری ہے ——

باپ ۔ مجھے روی سے زیادہ اپنی ہٹ پیاری ہے۔ تو اپنے دل سے کہہ رہی ہے ؟

تجھے کیا معلوم جب سے ردی گیا ہے، میرا چین سکون سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ میں راتوں کو سوتے سوتے اُٹھ بیٹھتا ہوں، اور پھر جیسے کوئی میرا گلا آن دبوچتا ہے۔ نہ میں چیخ سکتا ہوں نہ چلا سکتا ہوں۔ اور درد و کرب کی شدت سے آنسو میری آنکھوں سے خون کی بوندوں کی طرح چونے لگتے ہیں۔ میں نے اس سے کتنی اُمیدیں وابستہ کی تھیں۔ آج بھی میرے کانوں میں وہ شہنائیاں گونجتی ہیں، جو اس کی شادی پر بجتیں۔ آج بھی میری آنکھوں کے آگے وہ روشنیاں اور وہ نظارے چکر کاٹتے ہیں، جو اُس کی شادی پر ہوتے ـــــــ ردی نے بڑی بے دردی سے میرے اَرمانوں کا خون کر دیا۔

ماں ۔ اور اس کا بدلہ تم نے مجھ سے لیا ہے؟ مجھے اپنے کلیجے کے ٹکڑے سے الگ کر کے تِل تِل جلنے کو چھوڑ دیا؟

باپ ۔ تو اب تو چاہتی کیا ہے؟ صاف صاف بتا، تو مجھ سے کیا کرانا چاہتی ہے؟

ماں ۔ میں؟ میں کیا چاہوں گی، اب چاہنے کو موت کے سوا رہ ہی کیا گیا ہے۔ جو کچھ رہا ہے، وہ کل ختم ہو جائے گا پھر مجھے اپنا کندھا دے کر گنگا کنارے میری راکھ کر آنا۔

باپ ۔ دیکھ اِس طرح مت کہہ، مجھ سے وہ کام نہ کرا، جو میں نے زندگی بھر نہیں کیا۔ میری آنکھوں میں آنسو دیکھنے کی کوشش مت کر۔ تو کہتی ہے تیرے لئے زندگی میں کچھ نہیں رہا، لیکن میرے لئے کیا رہ گیا ہے؟ میرا جسم جواب دے گیا ہے۔ بیٹیاں پرائی ہو گئی ہیں۔ بیٹے باغی ہو گئے ہیں۔ سب مجھ سے بیزار ہو گئے ہیں۔

ماں ۔ لیکن یہ تو جگ کی ریت ہے۔ برگد بھی بوڑھا ہو جاتا ہے تو اس کے تنے

بوڑھی جڑ کے سہارے رہنے کے بجائے اپنی جڑیں الگ جما لیتے ہیں۔ اور تم کو تو خوش ہونا چاہیئے کہ تمہارے گڈے اور ننّے تمہاری طرح ہیں۔ ان میں تمہاری ہی طاقت اور تمہاری ترشی ہے۔ وہ بھی تمہاری ہی طرح دُنیا کے راستے پر چلنے کے بجائے دُنیا کو اپنے راستے پر چلاتے ہیں۔ وہ جھکتے نہیں ہیں، دُنیا کو جھکاتے ہیں۔

باپ۔ (حیرت سے) تو ...... تو یہ کیا کہہ رہی ہے

ماں۔ جو مجھ گنوارن کو دیکھتا ہے۔ تم کن سے ٹکر لینے چلے ہو؟ اپنوں سے؟ بھلا کوئی اپنوں سے لڑا ہے؟ کوئی اپنوں سے جیتا ہے؟ اور جو جیتا ہے، وہ اپنوں کو توڑ کر، اُن کو ہرا کر کبھی خوش ہوا ہے؟ تم ان کی جیت کو اپنی جیت کیوں نہیں سمجھتے؟ تم اُن کی ہٹ کو اپنی ہٹ کیوں نہیں سمجھتے؟ آخر وہ کس کے ہیں؟ کیا وہ تمہارے اپنے ہی نہیں ہیں؟

باپ۔ (جیسی روشنی دیکھ لی) رودی کی ماں —— بس اب تو اور نہ کہہ۔ اگر رودی کی ضد میں میری ہی ضد ہے، اگر رودی کی خوشی میں میری ہی خوشی ہے، اگر اس کی شادی میں ہماری ہی شادکامی ہے، تو چل اُٹھ —— وہ اکیلا شادی نہیں کرے گا۔ اس کا سہرا ہم اپنے ہی ہاتھوں سے سجائیں گے۔

ماں۔ (مسرت سے) رودی کے باپو۔

باپ۔ (عزم سے) ہاں —— اب رودی اپنی شادی خود نہیں کرے گا۔ اس کی شادی ہم کریں گے —— ہم —— تو اور مَیں ٭

(پردہ)

کردار

کرنل:۔ ایک بیدار مغز انسان ۔ **جنرل:۔** ایک سخت فوجی افسر ۔
میجر:۔ ایک حساس شاعر ۔ **سارجنٹ:۔** ایک قنوطی انسان ۔
نوجوان عورت:۔ خوبصورت مگر پاگل ۔
بوڑھی عورت:۔ پاگل عمر رسیدہ ۔
ڈاکٹر، نرس اور مختلف آوازیں ۔

تصور:۔ اگر تیسری بڑی لڑائی ہوئی تو ایٹمی ہتھیاروں کا استعمال ہوگا ان سے جو تباہی پھیلے گی اور انسانی نسل کے لئے جو خطرہ پیدا ہوگا اُس کا تصور اس ڈرامہ میں کیا گیا ہے۔

زمانہ:۔ تیسری ایٹمی جنگ ہو چکی ہے، جس کے نتیجے کے طور پر دُنیا کے بیشتر ممالک برباد ہو چکے ہیں۔
مقام:۔ ایک مُلک جو کبھی دُنیا کا سب سے ترقّی یافتہ ملک تھا۔
منظر:۔ اس ملک کے اس علاقہ کے اُوپر اُڑتا ہوا جہاز، جہاں کبھی راجدھانی تھی۔

کرنل ۔ ۷۷۸۶ ، ہم سات ہزار سات سو چھیاسی میل کا فاصلہ طے کر چکے ہیں ۔ سارجنٹ اب ہم کو پورب کی طرف ۸۰ ڈگری کے زاویہ پہ مڑنا ہے ۔ اور اس کے بعد ہم پانچ منٹ کے اندر اندر راجدھانی پہ اُڑ رہے ہوں گے ۔

سارجنٹ ۔ (ایک ایسے لہجہ میں جس میں طنز اس طرح رچ گیا ہے ، جس طرح جنگلی لوگوں کے تیر کی نوکوں میں زہر) ہاں کرنل ۔ یہاں سے پورب کی طرف ۸۰ ڈگری کے زاویہ پہ مڑ کر پانچ منٹ کے اندر اندر ہم اُس جگہ اُڑ رہے ہوں گے ، جہاں نقشہ کے مطابق راجدھانی ہونی چاہیئے ۔

کرنل ۔ (سختی سے) سارجنٹ ۔

سارجنٹ ۔ (متاثر ہوئے بنا) کرنل آپ کا کام آسمان کی بلندیوں میں پرواز کرنا ہے لیکن آپ نے میرے سپرد زمین کی طرف دیکھتے رہنے کا کام کیا ہے ۔ مَیں زمین کی طرف دیکھ رہا ہُوں ۔

کرنل ۔ تم زمین کی طرف نہیں دیکھ رہے ہو ، بلکہ اپنے اندر دیکھ رہے ہو ، جہاں سب کچھ مُر چکا ہے ۔ ہمت ، حوصلہ ، اُمید ، ارمان ۔ جنگ نے تمہارے اعصاب کو شکستہ کر دیا ہے ۔

سارجنٹ ۔ آپ بجا فرما رہے ہیں کرنل میرے اعصاب شکستہ ہو چکے ہیں ۔ شائد اسی لیئے پُورے یورپ کے اُوپر سے اُڑتے ہوئے مجھے کہیں بھی ایک سالم عمارت ، ایک آباد شہر یا منظم علاقہ نظر نہ آیا ۔

کرنل ۔ تمہیں کسی جگہ بھی آبادی کے نشان نظر نہیں آئے ؟ سارجنٹ تم شاید اپنے ہوش حواس بھی گنوا بیٹھے ہو ۔ تمہارا حافظہ بھی جواب دے گیا ہے ۔

سارجنٹ ۔ ہاں کرنل ، میرا حافظہ جواب دے گیا ۔ ورنہ مجھے ضرور یاد رہتا کہ مَیں نے شہروں کی جگہ ملبے کے لاتعداد ڈھیر دیکھے ۔ جہاں کبھی اِنسان آباد تھے ۔

وہاں چوپایوں کو گھومتے دیکھا۔ ہاں جنگلوں میں مجھے کہیں کہیں انسان بھی
نظر آئے تھے۔ یہ سب آبادی ہی کے نشان ہیں کرنل۔

کرنل۔ سارجنٹ خاموش ہو جاؤ۔ تم سے گفتگو کرنا حماقت ہے۔ میں راب بھائی پہنچتے
ہی تم کو فوج سے ریلیز کرا دوں گا۔ تم فوج میں رہنے کے قابل نہیں رہے ہو۔

سارجنٹ۔ ہاں کرنل۔ میں تیسری جنگ لڑ چکا ہوں۔ ایٹم بموں اور ایٹمی ہتھیاروں سے
اس دنیا کو اس حد تک برباد کر چکا ہوں، کہ چوتھی جنگ کی ضرورت نہ ہوگی۔
اب میں واقعی فوج میں رہنے کے قابل نہیں رہا۔

کرنل۔ سارجنٹ۔ خدا کے واسطے یہ باتیں بند کرو۔ تم بھی جانتے ہو، میں بھی جانتا
ہوں ہم سب جانتے ہیں، کہ ہم نے اپنا گلا اپنے ہاتھوں سے کاٹ لیا ہے تیسری
بڑی جنگ لڑ کر اور ایٹم کی طاقت کا استعمال کر کے ہم نے اپنے اور اپنے
دشمن کے علاوہ کروڑوں بے گناہ لوگوں کی زندگیاں بھی خاک کر ڈالیں لیکن اگر
اتفاق سے ہم بچ گئے ہیں۔ تو ہمیں زندہ رہنا ہوگا۔ تمہاری باتوں میں تو خودکشی
کی ترغیب ہے۔

سارجنٹ۔ لیکن خودکشی سے خوف کس لئے کرنل؟ جو کھیل ہم نے کھیلا ہے، خودکشی
اس کا آخری منظر ہے۔ میں کھیل کو مکمل دیکھنا چاہتا ہوں۔

کرنل۔ زندگی کھیل نہیں ہے سارجنٹ۔ زندگی جد و جہد ہے۔ جنگ ہے۔

سارجنٹ۔ تو اور اچھی بات ہے کرنل۔ جب دشمن کی طاقت توڑ دی جاتی ہے، تو
اس کے بچے کھچے سپاہیوں کو چن چن کر مارا جاتا ہے اسے Mopping up
Mopping up operation کہتے ہیں۔ ہم بھی بچے کھچے لوگوں کے خلاف
کیوں نہ شروع کر دیں؟

کرنل۔ تم پاگل ہو گئے ہو، تمہارا ذہن ناکارہ ہو چکا ہے۔

سارجنٹ۔ نہیں نہیں کرنل۔ ایسا نہ کہو۔ لو میں اپنی ہوشمندی کا ثبوت دیتا ہوں۔ وہ دیکھو، ہم راجدھانی کے قریب آ گئے ہیں۔ وہ دیکھو، سامنے پورب کی طرف، میلوں تک پھیلے ہوئے ملبے کے وہ اونچے اونچے ڈھیر۔

کرنل۔ اوہ۔ ہاں، ہاں سارجنٹ۔ ہم راجدھانی پہ پہنچ گئے۔ وہ دیکھو راجدھانی کے بیچ میں سے بہتی ہوئی ندی دھوپ میں ننگی تلوار کی طرح چمک رہی ہے۔

سارجنٹ۔ ہاں کرنل۔ ندی واقعی راجدھانی کے سینہ پر ننگی تلوار کی طرح چمک رہی ہے

کرنل۔ (غصہ سے) shut up you fool (چند لمحات کی خاموشی کے بعد) اوہ، آج ڈھائی سال بعد اپنے ملک کی راجدھانی کا نظارہ کر رہا ہوں۔ اتنے طویل عرصہ بعد مہذب دُنیا کی آغوش میں لوٹ کر آنا، نئے سرے سے پُرانی زندگی شروع کرنا، جنگ کے ان ہولناک دنوں اور خطروں کے نہ ختم ہونے والے ہفتوں، مہینوں اور برسوں کے بعد ایک بار پھر چین سے آنکھیں موند کر سونا اور صبح اُٹھ کر السائی ہوئی آنکھوں سے سورج کی نارنجی کرنوں کو پھیلتے ہوئے دیکھنا ——— سارجنٹ ہم واقعی بہت خوش نصیب ہیں۔

سارجنٹ۔ (طنز سے) یقیناً کرنل ——— اور تیار ہو جائیے، اس دُنیا میں اُترنے کے لیے، جو آپ ہی کی طرح خوش نصیب ہے۔

(جہاز کے نیچے اُترنے کی آواز)

دُوسرا منظر

(ایک زمین دوز تہہ خانہ کا کمرہ۔ اس میں بڑی میز پہ ایک فوجی افسر بیٹھا ہوا ہے۔ کرنل اندر داخل ہوتے ہیں، اور آتے ہی فوجی سلام بجاتے ہیں۔)

جنرل ۔ ایٹ ایز ، ایٹ ایز (At ease) کرنل ۔ تشریف رکھئے اور تکلف ترک کیجئے ۔ ہم لوگ تعداد میں اس قدر کم رہ گئے ہیں ، اور ہماری ملاقات کا دائرہ اتنا تنگ ہو گیا کہ ہم نے تمام فوجی تکلفات ترک کر دئیے ہیں ۔ آپ آرام سے بیٹھئے ۔

کرنل ۔ شکریہ جنرل ۔ آپ کو شاید معلوم ہو ، پریسیڈنٹ صاحب نے اپنے خاص حکم سے مجھے قطب شمالی بھیجا تھا ۔ ان کا حکم تھا کہ اگر دشمن سے لڑائی چھڑ جائے اور وہ ایٹمی ہتھیار استعمال کرے تو میں لڑائی کے بعد سارے یورپ کا جائزہ لے کر حالات کی رپورٹ دوں ۔ اب میں اپنی رپورٹ مکمل کر کے لایا ہوں ، اور پریسیڈنٹ صاحب سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں ۔

جنرل ۔ پریسیڈنٹ ۔ (کھانستا ہے ۔ کرنل بات یہ ہے ۔ کہ موجودہ حالات میں میرا خیال ہے ، اس ملک کا پریسیڈنٹ ، میں ہی ہوں ۔

کرنل ۔ آپ ؟

جنرل ۔ ہاں کرنل ۔ راجدھانی کے قریب چار ہائیڈروجن بم گرے ۔ جن کی وجہ سے تمام شہری افسر ہلاک ہو گئے ۔ پریسیڈنٹ صاحب اُس دن راجدھانی میں موجود نہ تھے ، اس لئے وہ بچ گئے ۔ لیکن بعد میں وہ بھی ——— (سہم کر) لیکن وہ ایک لمبی داستان ہے ۔ فی الحال یہی کافی ہوگا ، کہ آپ مجھے ہی پریسیڈنٹ خیال کریں ۔

کرنل ۔ میں آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں ۔

جنرل ۔ شکریہ ۔ شکریہ ۔ آپ بے حد تھکے معلوم ہوتے ہیں ۔ کچھ شغل کیجئے ۔ (گلاس میں شراب انڈیلتا ہے)

کرنل ۔ Thank You Genral (تھینک یو جنرل)

جنرل ۔ کرنل ۔ ہم بہت بُرے وقت سے گزرے ہیں ۔ ہمیں نہیں معلوم کہ دُشمن پر کیا گزری ۔ لیکن ہمارا ملک پُوری طرح تباہ ہو گیا ہے ۔ دشمن کے ہائیڈروجن بموں اور راکٹوں نے ہماری ریلوں اور آنے جانے کے تمام راستوں کو برباد کر دیا ۔ ملک کا شیرازہ بکھر گیا ، پریسیڈنٹ اور بڑے بڑے فوجی افسروں نے ملک کے انتظام کو دُرست کرنے کے لئے لمبے لمبے دَورے کئے ۔ مگر اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ انہیں اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا ۔

کرنل ۔ کیا انہیں شُوٹ کر دیا گیا ؟

جنرل ۔ نہیں ، کرنل ۔ ریڈیو ڈسٹ ۔ وہ ریڈیو ڈسٹ کا شکار ہو گئے ۔

کرنل ۔ (خوف سے) ریڈیو ڈسٹ ؟

جنرل ۔ ہاں ۔ تم تو جانتے ہو کہ یہ ریڈیو ڈسٹ کیا بلا ہے ہائیڈروجن بموں کے پھٹنے سے آزاد ہونے والی تباہ کُن بجلی مٹی کے ذرّہ ذرّہ میں سرایت کر گئی ہے ۔ سب کچھ ریڈیو ایکٹو ہو گیا ہے ، اور اس کی وجہ سے چیزوں کی شکلیں مسخ ہونے لگی ہیں ۔ جانداروں کے اعضاء نامعلوم طور پر گلنے لگے ہیں ۔

کرنل ۔ تو پریسیڈنٹ اور دوسرے فوجی افسر ۔

جنرل ۔ ہاں ، وہ ایسے علاقوں میں گھومتے پھرے ، جہاں یہ بم پھٹے تھے ۔ اور نتیجہ کے طور پر اُن کی ہڈیاں گل گئیں ۔

کرنل ۔ (خوف زدہ ہو کر) اوہ ۔

جنرل ۔ پریسیڈنٹ کے بعد چیف آف جنرل سٹاف نے ملک کی باگ ڈور سنبھالی ۔ لیکن ایک دن جب انہیں معلوم ہُوا کہ ریڈیو ڈسٹ ان کے اندر پہنچ گئی ہے تو انہوں نے اپنے کو کمرے میں بند کر کے خودکشی کر لی ۔

کرنل ۔ اوہ ۔ تو کیا ریڈیو ڈسٹ ہر جگہ پھیل گئی ہے ؟

جنرل۔ ہر جگہ تو نہیں، لیکن ملک کے کافی حصّہ میں اس کا اثر ہے۔ ہاں، یہاں اس کا اثر نہیں ہے، اور خدا نے چاہا تو آئندہ بھی یہ جگہ محفوظ رہے گی۔

کرنل۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟ ہوا تو مٹی کے ان ذرّوں کو ہر جگہ پھیلا دے گی۔

جنرل۔ ہاں، ہمارے ماہر سائینس دان تو یہ بھی کہتے ہیں کہ کچھ دنوں میں دنیا کا کوئی حصّہ اس کے اثر سے محفوظ نہیں رہیگا۔ لیکن مَیں یقین نہیں کرتا۔ ہم اس کے اثر کی روک تھام کر سکتے ہیں۔ لیکن کیا کریں۔ ابھی سرکاری طور پر جنگ ختم نہیں ہوئی۔ اور اس لیئے ہم کُھلے بندوں باہر نکل کر کام نہیں کر سکتے۔

کرنل۔ جنرل ہمارے مُلک کی طرح دشمن کا ملک بھی برباد ہو چکا ہے۔ یورپ تو پوری طرح تباہ ہو گیا ہے۔ جنگ جاری رکھنے کا سوال تو دُور رہا، اَب تو عام شہری زندگی کا انتظام کرنا بھی ناممکن ہو گیا ہے۔ آپ اس جنگ کو نہیں، بلکہ آئندہ کی تمام جنگوں کو ختم ہُوا سمجھئے۔ اب انسان صدیوں تک اس قابل نہ ہو گا کہ جنگ و جدال کی بات بھی ذہن میں لا سکے۔

جنرل۔ یہ تمہارا پختہ یقین ہے؟

کرنل۔ یقین نہیں بلکہ ایمان۔ جنرل مَیں نے اپنے ایٹم کی طاقت سے چلنے والے جہاز میں بیٹھ کر سارے اُتری علاقوں اور یُورپ کے اُوپر اُڑان کی ہے۔ اور اپنے مشاہدات کی بنا پر مَیں آپ کو یقین دِلا رہا ہوں کہ جنگ ختم ہو چکی ہے۔ ہم بے خوف باہر آ کر تعمیرِ نو کا کام شروع کر سکتے ہیں۔

(دروازہ کھول کر میجر ڈین داخل ہوتا ہے۔ لیکن دونوں کو گفتگو کرتے دیکھ کر واپس جانے لگتا ہے۔)

میجر۔ اوہ۔ افسوس ہے جناب۔ مجھے معلوم نہیں تھا آپ گفتگو میں لگے ہُوئے ہیں۔

جنرل۔ واپس نہ جاؤ میجر۔ تمہارے آنے سے کوئی خلل نہیں ہوا۔ مَیں خود تم کو بُلانے کی سوچ رہا تھا۔ کرنل، یہ میجر ڈیتن ہیں۔ میرے ملٹری سیکرٹری۔ آپ قطب شمالی کی دیکھ بھال چوکی سے ڈھائی سال بعد گھر آتے ہیں۔ کرنل ڈرمنڈ۔

میجر۔ Glad to meet you cornel (گلیڈ ٹو میٹ یُو کرنل)

کرنل۔ تھینک یُو میجر۔

جنرل۔ کرنل تم ذرا میجر سے باتیں کرو۔ مَیں غسل خانہ ہو کے آتا ہوں۔ پھر ہم ایک ساتھ گھر چلیں گے۔ میری بیوی تم سے مل کر بےحد خوش ہوگی۔

کرنل۔ شکریہ جنرل (جنرل چلا جاتا ہے) اوہ، آج ڈھائی سال بعد مجھے یہاں آکر محسوس ہوُا ہے کہ مَیں زندہ ہوں، اور اپنے گھر لوٹ آیا ہُوں۔

میجر۔ آپ بہت اچھا طنز کرتے ہیں کرنل۔

کرنل۔ (چونک کر) طنز؟ نہیں مَیں طنز نہیں کر رہا۔ مَیں واقعی اپنے محسوسات کی ترجمانی کر رہا ہوں۔

میجر۔ تب آپ بےحد خوش قسمت آدمی ہیں کرنل۔ اور اس دَور کے لئے آپ جیسے آدمیوں ہی کی ضرورت ہے۔

کرنل۔ مَیں تمہاری بات نہیں سمجھ رہا میجر۔

میجر۔ آپ سمجھ بھی نہیں پائیں گے کرنل۔ جنرل بھی یہی کہتے ہیں۔ میری بات کوئی نہیں سمجھتا، اور ٹھیک بھی ہے کرنل۔ مُردوں کی زبان زندہ انسان نہیں سمجھ سکتے۔

کرنل۔ مُردوں کی زبان؟

میجر۔ ہاں کرنل۔ مَیں مُردہ ہی تو ہُوں۔ ڈھائی سال پہلے جس دن دُنیا کی سب سے خطرناک جنگ شروع ہوئی تھی، اور مجھے شاعری کی دُنیا سے گھسیٹ کر

خاکی وردی پہنا دی گئی تھی، میں تو اُسی دن مر گیا تھا۔ صرف اتفاق سے میرا جسم آج تک دُنیا کے کھنڈروں میں گرفتار ہے۔

کرنل۔ اوہ، میں سمجھا تم شاعر ہو۔

میجر۔ میں آسیب ہوں کرنل، جو شمشان میں دن کے وقت درختوں کی شاخوں پر منڈلاتا رہتا ہے، اور رات کو سوکھی ہڈیاں رگڑ رگڑ کر شعلے پیدا کرتا رہتا ہے۔

کرنل۔ میجر، یہ درست ہے کہ میں تمہاری طرح حساس آدمی نہیں ہوں میں ایک پرانا فوجی ہوں۔ اس لئے موت اور تباہی کا مجھ پر زیادہ اثر نہیں ہوتا۔ لیکن مجھے یہ تسلیم کرنے میں جھجک نہیں، کہ مجھے بھی اس جنگ سے اتنی مکمل تباہی کی اُمید نہ تھی۔

میجر۔ اُمید اور جنگ سے، کرنل تم ہمیشہ سپاہی ہی رہو گے۔ تم ایک عام انسان کی طرح کبھی نہ سوچ سکو گے۔ تم اس حقیقت کا ادراک کبھی نہ کر سکو گے۔ کہ عام آدمی کی دنیا میں جنگ کے لئے کوئی گنجائش نہ تھی۔ بجز رنج والم اُس نے جنگ سے کوئی توقع وابستہ نہ کی تھی۔ جنگ اس کے سر پہ اس طرح منڈھ دی گئی تھی، جس طرح میرے شانوں پر یہ خاکی وردی۔ اوہ مجھے معاف کرنا کرنل میں آج پھر بہک گیا ہوں۔

کرنل۔ نہیں نہیں میجر۔ تم سے مل کر آج مجھے محسوس ہو رہا ہے، جیسے میرے اندر ایک نیا احساس پیدا ہو رہا ہے۔ ایک چشمہ پھر سے جاری ہو رہا ہے، جو مدتیں گزریں، بند ہو گیا تھا۔ مجھے موقع دو کہ ہم کہیں ساتھ تنہا کچھ وقت گزاریں۔

میجر۔ تنہا؟ کرنل، تہہ خانوں کے اندر اور ملبہ کے ڈھیروں پر۔ اب تنہائی اور

خاموشی ہی اُونگھتی ہے۔ اب آپ اس رُوح فرسا تنہائی سے بچ نہیں سکتے۔

کرنل۔ تم کو دُنیا کے برباد ہونے کا بے حد غم ہے میجر؟

میجر۔ نہیں کرنل۔ مجھے کسی چیز کا غم نہیں ہے۔ مَیں تو ایک عذاب زدہ رُوح ہُوں۔

(جنرل داخل ہوتا ہے)

جنرل۔ آؤ کرنل۔ ہم گھر چلیں۔ میجر آپ بھی آجائیے گا۔ وہاں لنچ کے بعد۔۔۔۔۔

میجر۔ بہت بہتر جنرل۔ (دونوں چلے جاتے ہیں)

* * * * * * * * * *

تیسرا منظر

(جنرل کے مکان کا خوبصورت ڈرائینگ رُوم)

کرنل۔ جنرل، یہ کیسے ہُوا کہ شہر برباد ہو گیا۔ لیکن یہاں ریڈیو ایکٹیوٹی کا اِتنا زیادہ اثر نہیں ہُوا؟

جنرل۔ وہ اس لئے کہ جب ہائیڈروجن بم گرنے شروع ہُوئے، تو راجد ھانی کے تمام شہری اس جگہ کو چھوڑ کر چلے گئے۔ کیونکہ ان کا خیال تھا، کہ دُشمن راجدھانی پر سب سے زیادہ بم گرائے گا۔ لیکن بم نشانے پر نہ گرے، اور آس پاس کے علاقوں میں گرے۔ جہاں لوگوں نے پناہ لی تھی۔ اِسی طرح بیشتر لوگ تو ہلاک ہو گئے، اور جو بچے، ان کے جسم میں ریڈیو ڈسٹ پہنچ گئی۔ جب بمباری بند ہُوئی تو ان لوگوں نے راجدھانی میں آنا چاہا، لیکن ہم نے انہیں نہ آنے دیا۔ تاکہ راجدھانی میں ریڈیو ڈسٹ کا اثر نہ پھیل جائے۔ اب راجدھانی میں صرف وہی لوگ رہتے ہیں، جو بمباری کے وقت خاص تہہ خانوں میں چلے گئے تھے۔ یا جو فوجی افسروں کے رشتہ دار ہیں۔

کرنل۔ اور عام شہریوں کو اُن کے حال پر چھوڑ دیا گیا؟

جنرل ۔ ہم اس کے علاوہ کر بھی کیا سکتے ہیں کرنل ؟ ان لوگوں کی امداد کرنا اپنے کو ختم کرنا ہے اور ہماری زندگیاں ان لوگوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ قیمتی ہیں۔

کرنل ۔ اگر اس وقت میجر موجود ہوتا تو وہ کہے بغیر نہ رہتا، کہ جن لوگوں نے دُنیا کو تباہ کیا ہے، جو انسانیت کے قاتل ہیں، ان کی زندگی واقعی عام معصوم انسانوں کی زندگیوں سے زیادہ قیمتی ہیں۔

جنرل ۔ وہ پاگل ہے کرنل۔ لیکن ہمارے پاس افسروں کی بہت کمی ہے، اور وہ بہت ذہین ہے۔ اس لئے ہم اُسے کھونا نہیں چاہتے۔

کرنل ۔ (بات بدل کر) اور باقی ملک کی کیا حالت ہے ؟ کیا وہاں بھی لوگوں کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا گیا ہے ؟

جنرل ۔ ہاں۔ فی الحال ہمیں ملک کی اصلی حالت کے بارے میں بہت کم معلومات حاصل ہیں۔ ریلیں تباہ ہو گئی ہیں۔ سارے مُلک میں پٹرول کے صرف دو چشموں پر ہی ہم کام جاری کر سکے ہیں۔ اس لئے دُور دراز علاقوں کا سفر قطعی ناممکن ہے۔ اس کے علاوہ ہم ان علاقوں میں اپنے فوجی بھیجنا نہیں چاہتے۔ جہاں ریڈیو ڈسٹ کا اثر ہے۔

کرنل ۔ لیکن پھر بھی مُلک کی عام حالت کے بارے میں کچھ نہ کچھ اطلاع ضرور حاصل ہوئی ہوگی ؟

جنرل ۔ ہاں، ہم نے فوج کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں محفوظ علاقوں میں تعینات کر دی ہیں۔ اور انھوں نے جو خبریں بھیجی ہیں، اُن سے معلوم ہوتا ہے، کہ جب ایٹم بم گرنا شروع ہوئے تھے، تو سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ شہر برباد ہو گئے۔ لوگ جنگلوں میں بھاگ گئے۔ بعد میں جب ریڈیو ڈسٹ پھیلی، تو لوگ

ایسے علاقوں میں اکٹھا ہونے لگے، جہاں ریڈیو ڈسٹ کا اثر نہ تھا۔ ایسی جگہوں پر اتنے لوگ جمع ہو گئے کہ جگہ کی تنگی اور کھانے پینے کی چیزوں کی کمی کے باعث لوٹ مار اور قتل و غارت گری عام ہوگئی۔ پولیس کا انتظام ختم ہو ہی چکا۔ اس لئے لوگ جتھے بنا کر ڈاکہ ڈالتے، اور قتل و غارتگری کرتے پھرتے ہیں۔

کرنل ۔ اوہ، تب تو تمام ملک میں قحط پڑ رہا ہوگا؟

جنرل ۔ ہاں۔ اب تو پھر بھی حالات قدرے بہتر بتائے جاتے ہیں، ورنہ جس سال بمباری ہوئی تھی، اس سال کھڑی فصلیں جل گئیں اور نئی فصلیں بوئی نہ جا سکیں پہلے مہینوں میں لوگوں نے جنگل جانوروں کے علاوہ تقریباً تمام پالتو جانوروں کو مار مار کر کھا ڈالا۔ ایک اندازہ یہ ہے کہ ملک کے ۹۰ فیصدی گائے بیل اور ۸۰ فیصدی گھوڑے مار کر کھا ڈالے گئے ہیں۔ خود میں نے بارہ گھوڑے کھا ڈالے۔ بلکہ ایک دفعہ تو کتے اور بلیوں تک کو نوالا بنانا پڑا۔

کرنل ۔ اوہ۔ اور اب؟

جنرل ۔ اب ہم یقیناً بہت بہتر حالت میں ہیں۔ فوج کھیتی باڑی کے کام پر لگی ہوئی ہے اور جانوروں کی نسل بڑھانے کے کام میں بھی خاصی ترقی حاصل کی گئی ہے۔

کرنل ۔ (اچانک کھڑکی سے باہر دیکھ کر) جنرل ۔۔۔ کھڑکی سے باہر دیکھئے، وہ کیا ہے؟

جنرل ۔ کہاں، اوہ! اوہ ۔ وہ گھوڑے کا بچہ ہے۔

کرنل ۔ (عجلت سے) مگر اس کی ٹانگیں! اس کا منہ! گھوڑے کی ٹانگیں لمبی ہوتی ہیں۔ اور اس کا منہ لمبوترا ہوتا ہے۔

جنرل ۔ ہاں، لیکن اس کی ٹانگیں ایک ڈیڑھ فٹ سے زیادہ لمبی نہیں ہیں۔ اور اس کا منہ سور کی طرح چپٹا اور گول ہے۔ (گہرے لہجے میں) یہ ناقص ہے۔

کرنل ۔ ناقص؟ یہ ناقص کیا ہوتا ہے؟

جنرل ۔ جن میں پیدائش کے وقت سے کوئی نقص ہوتا ہے، اُنہیں ناقص کہتے ہیں۔
کرنل، اب تم ایسے بہت سے جانور دیکھو گے، جن کی شکلیں ان کی اصلی شکلوں سے مختلف ہیں۔ اُس گلہری کو دیکھو، جو پیڑ کے تنے پر چڑھی جا رہی ہے۔

کرنل ۔ اوہ، اس کی دُم غائب ہے، اور جسم پر بال نہیں ہیں۔

جنرل ۔ ہاں، اور یہ سب ریڈیو ایکٹی وٹی (Radio activity) کا اثر ہے، جو اس وقت ہمارا سب سے بڑا اور خطرناک مسئلہ ہے۔ کرنل ہم ہائیڈروجن بموں سے بچ گئے ہیں، لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم ریڈیو ایکٹی وٹی (Radio activity) کے اثر سے نہ بچ سکیں گے۔
جانور تم نے دیکھ لئے۔ اب نباتات کو دیکھو، پیڑوں کو دیکھو۔ ان کے تنے گانٹھیں کھائے ہوئے ہیں۔ ان کی پتیاں آتے ہی جھڑ جاتی ہیں۔ پھولوں کے رنگ بدل گئے ہیں اور پھل داغدار ہوتے ہیں اور بات یہیں ختم نہیں ہو گئی کرنل۔ اس کا اثر انسانوں پر بھی پڑ گیا ہے۔ انسانی نسل کا مستقبل بھی تاریک ہو گیا ہے۔ (جنرل پر دورہ سا پڑ جاتا ہے)

کرنل ۔ جنرل! آپ کو کیا ہو گیا۔ آپ کا چہرہ پیلا پڑ گیا ہے۔ اور آپ کا جسم کانپ رہا ہے۔

جنرل ۔ کچھ نہیں، کچھ نہیں کرنل۔ تم سب کچھ جان جاؤ گے۔ میں سب کچھ تم کو بتا دوں گا۔ مگر اس وقت مجھے کچھ نہ کہو۔ مجھے اپنے کو، دنیا کو، اس کی ہر چیز کو، بھول جانے دو۔ بھول جانے دو۔ (جنرل چلا جاتا ہے۔ پردہ گر جاتا ہے)۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

چوتھا منظر

(جنرل کا وہی کمرہ۔ کرنل پیانو بجا رہا ہے۔ میجر پاس کھڑا ہے۔)

کرنل۔ میجر۔ دھوپ میں چمکتی ہوئی نیلی جھیل، اس کے کنارے، یہ سفید بنگلہ، بنگلے سے جھولتی ہوئی سرسبز بیلیں۔ اور اُن پر کھِلتے ہوئے سُرخ پھول۔ آج کتنے لمبے عرصہ بعد، جو میری پُوری زندگی سے بھی زیادہ لمبا معلوم ہوتا ہے، میں مہذب دنیا کے پُرسکون ماحول میں بیٹھا پیانو پر ایک نغمہ بجا رہا ہوں۔ سچ، یہاں آکر تو مَیں جنگ کی تمام ہولناکیوں اور تباہیوں کو بھُول گیا ہوں۔

میجر۔ تبھی تو اس دن مَیں نے کہا تھا کہ اِس دَور میں آپ جیسے انسانوں ہی کی ضرورت ہے کرنل۔ ایسے انسانوں کی جن کے نزدیک کبھی کوئی چیز اِس قابل نہیں ہُوئی کہ اُسے یاد رکھا جائے۔ یا اِس کے نہ رہنے کا غم کیا جائے۔

کرنل۔ مَیں تمہاری کسی بات کی تردید نہیں کروں گا۔ میجر تم کچھ بھی کہہ سکتے ہو۔

میجر۔ مگر مَیں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں۔ کرنل مجھے تعجب ہوتا ہے کہ ایک آدمی اِتنی جلدی، اِتنی بڑی دُنیا کی ہولناک تباہی کیسے بھُول سکتا ہے۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ ایک اِنسان اپنے ساتھ اور اپنی یادوں کے ساتھ کس طرح اِتنا سنگ دِل اور بے رحم ہو سکتا ہے۔ لیکن مَیں یہ سمجھ چکا ہُوں کہ اِس دُنیا میں وُہی اِنسان خوش رہ سکتا ہے، جو ہر چیز کو رات کے سپنے کی طرح بھُول جاتا ہے جس کی پلکیں نم ہوتا نہیں جانتیں۔

کرنل۔ لیکن تم ہی بتاؤ گزرے ہوئے لمحہ اور حادثہ کے لئے آنسو بہانے سے کیا حاصل؟

میجر۔ ٹھیک ہے کرنل، تم کو ایسا ہی کہنا چاہیئے، کیونکہ یہ تباہی تمہارے ہی جیسے لوگوں کی لائی ہوئی ہے۔ اور جب چیزوں کو تباہ کرتے وقت تمہارا ہاتھ نہ کانپا اور دِل نہ رویا، تو اب تم کیوں غم کرو گے! تمہارے نزدیک تو یہ سب ایک مشینی عمل کا لازمی نتیجہ ہے۔

کرنل۔ (غصّے سے بھڑک کر) میجر۔

میجر۔ ناراض نہ ہو کرنل، اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ تم خاندانی سپاہی ہو۔ تمہاری ساری زندگی پریڈ کرنے، ڈسپلن میں رہنے، اور ہر چیز پر بے دریغ گولی چلا دینے میں گزری ہے۔ تم نے زندگی بھر کسی چیز کی تخلیق نہیں کی۔ محبت تم نے صرف فولاد کے سیاہ ہتھیاروں سے کی۔ عورت کو تم نے فوجی راشن کی چیز سمجھا ہے۔ تم انسان نہیں ہو۔ تم گوشت پوست کے ایک آٹو میٹک ہتھیار ہو۔ اور دُنیا تمہارے لئے یا تو فوجی میس ہے یا چاند ماری کا میدان۔

(شدّت جذبات سے اُٹھ کر باہر جانے لگتا ہے)

کرنل۔ تم اُٹھ کر کہاں چل دیئے؟ ٹھہرو۔

میجر۔ نہیں کرنل۔ مجھے جانے دو۔ مَیں آپ کے، آپ کی اس دُنیا کے اور اس ماحول کے اہل نہیں ہُوں۔ مَیں ایک ملعون رُوح ہوں۔ مجھے جانے دو۔

(چلا جاتا ہے، جنرل آتا ہے)

جنرل۔ ہیلو کرنل۔ کیسے ہو رہے ہو؟

کرنل۔ اوہ جنرل۔ آیئے آیئے۔ میجر ابھی ابھی اُٹھ کر گئے ہیں۔

جنرل۔ کہاں؟

کرنل۔ وہ ناراض ہو گیا شائد۔

جنرل۔ اُس کے دماغ میں خلل ہے کرنل۔ وہ حقیقتاً فوج میں رکھے جانے کے قابل نہیں ہے لیکن اس کی فکر کو دفع کرو۔ تم یہ بتاؤ۔ اب تم کیسا محسوس کر رہے ہو؟

کرنل۔ جنرل، اب مَیں قطعی تندرست ہوں۔ یہاں کے آسودگی بخش ماحول سے میرے دِل و دماغ پر جادُو کا سا اثر کیا ہے۔ آپ مجھے حکم دیجئے۔ مَیں مہم پر جانے کے لئے تیار ہوں۔

جنرل۔ تو تم کو سارے ملک کا دورہ کرنے کے لئے تیار ہو جانا چاہیئے۔ میں چاہتا ہوں
کہ مجھے ملک کی اندرونی حالت سے آگاہ کرو۔ وہاں کتنے لوگ زندہ ہیں۔
ان کی کیا حالت ہے۔ پیداوار کے ذرائع کیا ہیں کس حد تک شہری انتظام
پھر سے قائم کرنے کا امکان ہے۔ غرضیکہ میں وہ تمام باتیں جاننا چاہتا ہوں۔
جن کی مدد سے ملک کو پھر سے سنوارنے کے لئے تجویز بنائی جا سکے اور جلد
سے جلد چناؤ کیا جا سکے۔

کرنل۔ لیکن اس سلسلے میں مجھے مدد کی ضرورت ہوگی۔

جنرل۔ وہ ملے گی۔ گو افسروں کی بہت کمی ہے، لیکن میں تمہارے لئے ایک ماتحت
افسر مقرر کر دوں گا۔ اور یہ نقشے آج سے تم اپنے پاس رکھو گے۔

کرنل۔ نقشے؟

جنرل۔ ہاں۔ ان میں وہ تمام علاقے نیلے نشانوں سے ظاہر کیئے ہوئے ہیں، جہاں تم کو
جانا ہے۔ ہرے نشان فوجی چوکیوں کو ظاہر کرتے ہیں، جہاں سے تم کو ہر قسم
کی مدد مل سکتی ہے۔

کرنل۔ اور یہ لال نشان؟

جنرل۔ یہ ان علاقوں کو ظاہر کرتے ہیں، جہاں یا تو سب کچھ تباہ ہو گیا ہے یا ریڈیو
ڈسٹ چھائی ہوئی ہے۔

کرنل۔ اتنے وسیع علاقے ہیں؟

جنرل۔ ہاں، یہ علاقے ملک کے کل رقبہ کے تقریباً دو تہائی کے برابر ہیں۔ لیکن ہم کو یہ
یہ حقیقت نظر انداز کرنا ہوگی۔ ہمارے اوپر ملک کی تمام ذمہ داری آگئی
ہے۔ ہم کو حوصلے، جانفشانی کے ساتھ کام کرنا ہوگا۔ مجھے مکمل اُمید
ہے کہ تم اس کام میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھو گے۔

کرنل ۔ مَیں آپ کو اپنی پُرخلوص سعی کا یقین دلاتا ہوں ۔
جنرل ۔ مَیں جانتا ہُوں کرنل ۔ مَیں جانتا ہوں ۔ ہم سب کو جان توڑ کر کوشش کرنا ہوگی ۔ یہ ہماری نسل کے مستقبل کا معاملہ ہے ۔
کرنل ۔ جنرل ، آج ہم کس حالت کو پہنچ گئے ہیں ۔ کل تک ہماری نگاہیں ستاروں کا تعاقب کیا کرتی تھیں اور ہمارے راکٹ چاند کی طرف پرواز کیا کرتے تھے ۔ لیکن آج ہم اپنے مُلک کے بارے میں ضروری باتیں معلوم کرنے سے بھی قاصر ہیں ۔ آج ہم وہاں کھڑے ہیں ، جہاں سے ہم نے صدیوں پہلے چلنا شروع کیا تھا ۔
جنرل ۔ تم اس مسئلہ کو مادی ترقی کے نکتہ نگاہ سے دیکھ رہے ہو کرنل ۔ لیکن مَیں اُسے خالص انسانی نکتہ نگاہ سے بھی دیکھ رہا ہوں ۔ تمہیں یاد ہے ، اُس دن مجھے دَورہ پڑ گیا تھا ؟
کرنل ۔ ہاں ہاں ۔ اس وقت آپ ریڈیو ایکٹی وِٹی (Radio activity) کے اثرات کے متعلق کچھ بتا رہے تھے ۔
جنرل ۔ ہاں وُہی ۔ مَیں اس موذی اثر کے متعلق تم کو بتانا چاہتا ہوں ۔ کرنل اس دن تم نے وہ گھوڑے کا بچہ دیکھا تھا ۔
کرنل ۔ ہاں ، وہ ناقص تھا ۔
جنرل ۔ انسانوں کے یہاں بھی ناقص بچے پیدا ہو رہے ہیں ۔
کرنل ۔ (خوف زدہ ہو کر) جنرل ۔
جنرل ۔ ہاں ۔ انسان بھی ریڈیو ایکٹی وِٹی (Radio activity) کے اثر کا شکار ہو چُکے ہیں ۔ مجھے اندرونی علاقوں میں رہنے والے لوگوں کے متعلق نہیں معلوم ۔ لیکن فوجی چوکیوں کے گِرد جو لوگ رہتے ہیں ، ان لوگوں کے

متعلق بتایا گیا ہے کہ ان کی اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت پہلے سے آدھی رہ گئی ہے۔ اور جو بچے پیدا ہوتے ہیں، ان میں سے آدھے سے زیادہ ناقص ہوتے ہیں۔

کرنل۔ آدھے سے زیادہ ناقص! آپ کیا کہہ رہے ہیں جنرل؟

جنرل۔ ہاں، اور جب تم ان بچوں کو دیکھو گے، تو ہیبت زدہ ہو جاؤ گے۔ ان میں سے کسی بچے کے دُم ہوتی ہے۔ کسی کی کلائیوں اور ٹخنوں کی ہڈیاں ننھے ننھے سینگوں کی طرح کھال کے باہر نکلی ہوئی ہوتی ہیں۔ کسی کے مُنہ میں جبڑا غائب ہوتا ہے، اور کسی کی ریڑھ کی ہڈی غائب ہوتی ہے۔ کل ایک بچے کے پیدا ہونے کی خبر ملی ہے، جس کے ناک کی جگہ سُونڈ ہے اور بازو اور ٹانگوں کے سروں پر اُنگلیوں کی بجائے گانٹھیں سی ہیں، جیسے کوڑھیوں کے ہوتی ہیں۔

کرنل۔ اوہ خدا۔ اوہ خدا۔ جنرل، کیا یہ بچے زندہ ہیں؟

جنرل۔ ہاں، اور جس لاڈ پیار سے ان کے ماں باپ ان کی پرورش کر رہے ہیں۔ اُسے دیکھتے ہوئے پوری اُمید ہے کہ وہ زندہ رہیں گے۔ بڑے ہوں گے اور اپنی نسلیں بڑھائیں گے۔

کرنل۔ اس طرح تو دو چار نسلوں میں اِنسان کی شکل اور جسمانی ساخت ہی بدل جائیگی؟ جنرل، کیا ہم اس لعنت کا کسی طرح مقابلہ نہیں کر سکتے؟ کیا ہم ریڈیو ڈسٹ کا بے بس شکار بن کر رہ جائیں گے؟

جنرل۔ مجھے کچھ نہیں معلوم کرنل۔ مجھے کچھ نہیں معلوم۔ مَیں خود رات کو سوتے سوتے ایسے ہی خواب دیکھ کر چیخ اُٹھتا ہُوں اور میری بیوی صبح ہونے تک روتی رہتی ہے، نہ جانے ہماری زندگی کا کل کیا گُل کھلائے گا۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

پانچواں منظر

(وہی کمرہ۔ میجر اور سارجنٹ باتیں کر رہے ہیں)

میجر۔ ہمارے اُڑنے کا وقت ہو گیا اور کرنل ابھی تک نہیں آئے؟

سارجنٹ۔ کوئی بات نہیں میجر۔ اب تمہیں پہلے کی طرح بم گرانے تو نہیں جانا، جو وقت کی پابندی لازمی ہو۔ اب تو ہمارا کام یہ رہ گیا ہے کہ ہم ملک کا دورہ کریں اور معلوم کریں کہ انسانیت کو مکمل طور پر تباہ کرنے میں ہم کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں

میجر۔ تمہاری باتیں بڑی عجیب ہوتی ہیں سارجنٹ؟

سارجنٹ۔ تمہیں میری باتیں سُن کر تعجب ہوتا ہے میجر؟ اور مجھے اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ میں ابھی تک بول سکتا ہوں میجر۔ کیا تمہیں محسوس نہیں ہوتا کہ ہم تم زندہ انسانوں کی مایوس بستی میں نہیں کھڑے ہیں، بلکہ ایک قبرستان میں کھڑے باتیں کر رہے ہیں۔

میجر۔ تم سے مل کر اور تمہاری باتیں سُن کر مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میں اکیلا نہیں ہوں۔ اس قبرستان میں گرفتار اور بھی بہت سی ملعون روحیں ہیں۔ سارجنٹ ہم تم اور ہماری جیسی بے شمار رُوحیں جنہیں ہم کبھی نہ جان سکیں گے، اس دُنیا میں آنے کے لئے نہیں تھیں۔ یہ دُنیا تو ایک قصاب خانہ ہے، یہاں ہر خوبصورت چیز کو ذبح کیا جاتا ہے۔ یہاں خوبصورتی زندہ نہیں رہ سکتی۔

سارجنٹ۔ تم خوبصورتی کی پرستش کرتے ہو؟

میجر۔ نہیں سارجنٹ۔ مَیں خوبصورتی میں جیتا ہوں۔ جہاں مَیں نے پہلے پہل آنکھ کھولی تھی، وہ بھی خوبصورتی کی گھاٹی تھی۔ پہاڑ کے دامن میں ایک پہاڑی ندی کے کنارے میرا گاؤں تھا۔ وہاں ہر طرف سبزہ تھا، پھول تھے، پھل تھے۔ وہاں کے مرد عورت سدا مُسکراتے رہتے تھے، اور ان کے چہروں پر مسرت و

شادمانی کا ایسا نارنجی نور بر ستا رہتا تھا۔ جیسے غروبِ آفتاب کے وقت
چیڑ کے پیڑوں کی چوٹیوں پر نظر آتا ہے۔ اسی گھاٹی کی خوبصورتی نے مجھے
زندگی کا پہلا درس دیا۔ اسی نے مجھے سکھایا کہ زندگی محبت ہے اور محبت
حسن۔ اور مَیں نے حسن سے محبت کی۔ بلکہ یوں کہو کہ حُسن کی دیوی خود چل کر میری
زندگی میں آئی۔ مَیں اس کے گرد طواف کرنے لگا۔ لیکن ایک دن مجھے اس کو
چھوڑ کر چلے جانا پڑا۔

سارجنٹ۔ چھوڑ کر؟ لیکن کیوں؟

میجر۔ ایک دن ہم چشمہ کے کنارے لیٹے ہوئے تھے۔ ایک نارنجی سی بے ہوشی
ہم دونوں پر طاری تھی۔ یکایک وہ بولی۔ مَیں ایک سُپنا دیکھتی آئی ہوں۔ میرا
بچہ پھول اور چاند کی طرح حسین ہو۔ تم میرا یہ سپنا پُورا کرو گے؟ (گہرا
سانس لیکر) اُسی وقت مَیں سینہ پر پتھر رکھ کر اس کے پاس سے چلا آیا۔

سارجنٹ۔ کیوں؟

میجر۔ مجھے دیکھ نہیں رہے ہو سارجنٹ مَیں خوبصورت نہیں ہوں مَیں کبھی اس کے
سپنے کو پُورا نہیں کر سکتا تھا۔ اور کسی کے خوبصورت سپنے کو توڑنا سب سے بڑا
گُناہ ہے۔ سمجھے؟

سارجنٹ۔ اور خوبصورتی کی افزائش کے لئے اپنی محبت اور خوشی تک کی قُربانی
دینے والا یہ دیوانہ آج ایسی دُنیا میں کھڑا ہے، جہاں سبزہ نہیں، پھُول نہیں،
مُسکراہٹ نہیں، محبت نہیں۔ میجر تم ان لوگوں کو کبھی معاف نہ کرنا جنہوں
نے تمہاری دُنیا کو اس طرح آگ لگا دی۔

میجر۔ میری دُنیا؟ سارجنٹ میری دُنیا میرے تصوّر میں ہے، جہاں میری محبوبہ پُھول
اور چاند سے حسین بچے کو گود میں لیئے لوری گا رہی ہے۔ مَیں اسی تصور میں جینا

ہوں ۔

(کرنل تیزی سے داخل ہوتا ہے ۔)

کرنل ۔ میجر، معاف کرنا مجھے دیر ہو گئی ۔

میجر ۔ اوہ آپ ۔ آپ آ گئے ۔

کرنل ۔ ہاں، مَیں جنرل صاحب سے باتیں کر رہا تھا ۔ سارجنٹ چلو، باہر ہوائی جہاز تیار ہے ۔

سارجنٹ ۔ بہت بہتر صاحب ۔ (تینوں جاتے ہیں ۔ ہوائی جہاز اُڑنے کی آواز)

* * * * * * * * * *

چھٹا منظر

(ایک میدان جہاں بہت سے آدمی جمع ہیں ۔ کرنل ایک اونچی جگہ پر کھڑا ہے ۔ لوگ اسے دیکھ کر بے قابو سے ہو رہے ہیں ۔)

آوازیں : ۱؎ یہ حکومت کا نمائندہ ہے، اسے مار ڈالو ۔

۲؎ ہمیں حکومت نہیں چاہیئے ۔

۳؎ اس حکومت نے ہمیں تباہ و برباد کیا ہے ۔ اسی کے طفیل ہم اس حالت کو پہنچے ہیں ۔

۴؎ دفن کرو، حکومت کو، اور حکومت کرنے والوں کو ۔

۱؎ یہ فوجی ہے، موت کا ایجنٹ ہے ۔ اسے تحت الثریٰ پہنچا دو ۔

۲؎ ہاں ہاں، یہ فوجی ہے ۔ یہ دشمن کا ہی نہیں، ہمارے خون کا بھی پیاسا ہے ۔

سب ملکر ۔ مارو، مارو ۔

کرنل ۔ (زور سے) رُک جاؤ، مجھ سے دور رہو، ورنہ ابھی سب کو گولی سے اُڑا دوں گا ۔

آوازیں ۔ دیکھتے کیا ہو، اکیلا ہے، اس پر ٹوٹ پڑو ۔

کرنل ۔ پاگل نہ بنو ۔ تم نے دیکھا تھا، وہ ہوائی جہاز، جو ابھی ابھی بستی کے اوپر اُڑ

رہا تھا۔ وہ میرا جہاز ہے، جو بستی کے باہر کھڑا ہے، اور جس میں میرے دو اور ساتھی ہی نہیں، بلکہ بم بھی ہیں۔

سب۔ بم۔ بم (مجمع میں چیخ و پکار مچ جاتی ہے، لوگ بھاگنے لگتے ہیں) بم۔ ایٹم بم۔ بھاگو، جان بچاؤ۔

کرنل۔ ٹھہرو، بھاگو مت۔ مَیں کہہ چکا ہوں، مَیں تمہیں نقصان پہنچانے نہیں آیا ہوں۔ مَیں تمہارا دوست ہوں۔ حکومت نے مجھے تم لوگوں کی تکالیف جاننے کے لئے بھیجا ہے۔ حکومت تم لوگوں کو رسد اور دوائیاں وغیرہ پہنچانے کی سکیم بنا رہی ہے۔

(لوگ پلٹ کر اس کے قریب آجاتے ہیں)

آواز ۲۔ رسد اور دوائیاں؟ ارے سنتے ہو۔ حکومت ہمارے لئے رسد اور دوائیاں بھیج رہی ہے۔

۱۔ کیا کہا، رسد اور دوائیاں۔

شور۔ کہاں ہیں؟ کہاں ہیں؟

کرنل۔ بے قرار نہ ہو، مَیں تم لوگوں کی ضروریات نوٹ کرنے آیا ہوں۔ میرے واپس جانے پہنچتے ہی تم کو ہوائی جہاز کے ذریعہ رسد پہنچادی جائے گی۔ مجھے اپنی ضرورتیں لکھاؤ۔

(مجمع کو چیر کر ایک عورت کرنل کے قریب جا پہنچتی ہے۔)

نوجوان عورت۔ تو لکھو۔ لکھو۔ میرے بچے کو دودھ چاہیئے ولبسکٹ چاہئیں، برانڈی چاہیئے، ایک پالنا چاہیئے۔ ایک چھوٹا سا خوبصورت مکان چاہیئے۔ اور ایک ——— ایک لمبی سی زندگی چاہیئے، جسے جنگ، بم، ایٹم بم کوئی ختم نہ کرسکے۔

ایک آواز۔ اب یہ سب کچھ تیرے بچے کے لئے چاہئیں آہاہا ہا۔ سُنا دوستو۔ اس کے بچے کے لئے۔ اس شیطان کی اولاد کے لئے۔ جس کی پیچھے دُم اور ماتھے پر سینگ نکلے ہوئے ہیں۔ ہا ہا ہا۔

عورت۔ کون کہتا ہے میرا بچہ شیطان کی اولاد ہے۔ میرا بچہ پھول اور چاند کی طرح حسین ہے۔ دیکھو۔ دیکھو۔ دیکھو۔

(عورت بچے کو ہاتھ میں اٹھا کر سب کو دکھاتی ہے اور پھر جب اپنے بچے کی طرف دیکھتی ہے، تو ایک چیخ مار اٹھتی، اس کا بچہ واقعی ناقص ہے)

عورت۔ ہائے میرا پھول، ہائے میرا چاند۔

آواز ۱۔ ارے اس پاگل عورت کو نکال دو۔ اسے اٹھا کر باہر پھینک دو۔

عورت۔ نہیں، نہیں مجھے اپنے بچے کی ضروریات لکھانے دو۔ مجھے دھکے دیکر نہ نکالو۔ اچھا میں اپنے بچے کی ضروریات نہیں لکھاؤں گی۔ مجھے صرف اتنا لکھوا لینے دو، کہ میرے بچے کو ایٹم بم نہیں چاہیئے۔ ایٹم بم نہیں چاہیئے۔

(لوگ اسے باہر نکال دیتے ہیں)

کرنل۔ یہ کون عورت تھی؟

آواز ۱۔ یہ پاگل عورت ہے کرنل۔ کبھی یہ بہت خوبصورت ہوا کرتی تھی۔ یہاں کا ایک بہت خوبصورت آدمی اسے بیاہ کر لایا تھا۔ یہ دن بھر گاؤں میں پھول چُنتی پھرا کرتی تھی۔ اور رات کو جھیل کے کنارے بیٹھی گھنٹوں چاند کا عکس دیکھا کرتی تھی۔ یہ کہا کرتی تھی، اس کا بچہ پھول اور چاند کی طرح خوبصورت ہوگا۔ اور سارے گاؤں والے بھی یہی کہتے تھے کہ اس کا بچہ غیر معمولی طور پر حسین ہوگا۔ لیکن جب بچہ ہوا تو اس کی پشت پہ دُم نکلی تھی، اور پیشانی پر دو سینگ۔

کرنل ۔ اوہ، تو یہاں بھی ریڈیو ایکٹی وِٹی (Radio activity)
کا اثر ہے؟

آواز ۱ ۔ ہم نہیں جانتے، کہ یہ کس چیز کا اثر ہے ۔لیکن کرنل اس سے دنوں کا چین غائب ہوگیا ہے، اور راتوں کی نیند حرام ہوگئی ۔ ہم نے تقریباً اپنے سب مسائل حل کرلئے ہیں۔ لیکن کرنل، جس چیز پر ہم قابو نہیں پا سکے ہیں، وہ یہ بلا ہے ۔

(یکایک ایک بوڑھی پاگل عورت کرنل کے برابر جا کھڑی ہوتی ہے)

بوڑھی پاگل عورت ۔ یہ بلا نہیں ہے، عذاب ہے، خدائی عذاب ہاہاہا۔ تم نے بائیبل نہیں پڑھی، شیطان نے فرشتے کو ورغلا لینا، اور تمام چیزوں کو داغی بنا دیا ہے ۔ یہ دُم دار بچے، لولے، لنگڑے، اندھے بچے، یہ بے دُم والے جانور ــــــ یہ مڑے ہوئے لنڈ منڈ پیڑ۔ عجیب رنگوں والے پھول اور سڑے ہوئے پھل۔ یہ عذاب ہے، خدائی عذاب۔ شیطان نے فرشتہ کو ورغلا لیا ہے۔ ہاہاہا۔

آواز ۱ ۔ اسے دھکیل کر باہر نکالو۔ اس کا دماغ چل گیا ہے۔

کرنل ۔ اسے باہر نہ نکالو۔ اس کے ساتھ زبردستی نہ کرو ۔ اگر یہ وبا عام ہوچکی ہے، تو تم کب تک ان کو دھکے دے کر اور پاگل قرار دے کر باہر نکالتے رہوگے ۔ تم نہیں جانتے، جو اب تک اس وبا سے محفوظ ہیں ۔ ہوسکتا ہے، آگے چل کر وہ بھی محفوظ نہ رہیں۔ ان کے یہاں بھی ایسے ہی بچے پیدا ہوں، جن پہ شیطان کا نشان ہو ۔

مجمع ۔ (بگڑ کر) یہ کیا بکواس کر رہے ہو۔

کرنل ۔ ویسا ہوچکا ہے، ایسا ہو رہا ہے ۔میں آدھے سے زیادہ ملک کا دورہ کرچکا

چکا ہوں۔ کوئی جگہ اور کوئی جاندار ریڈیائی ایکٹیویٹی کے اثر سے محفوظ نہیں ہے۔

مجمع۔ اوہ خدا۔ اوہ خدا۔

پاگل عورت۔ ہا ہا ہا۔ میں نے کہا نہیں تھا، کہ یہ خدائی عذاب ہے۔ اس سے بچنا محال ہے۔ قیامت آ رہی ہے۔ اس کے لئے تیار ہو جاؤ۔ ہا ہا ہا۔

ایک آواز۔ قیامت؟ شائد سچ مچ قیامت آ رہی ہے، کرنل صاحب۔ ہم اپنے باہر اور اردگرد تباہی اور مکمل بربادی کے اس ہولناک منظر کو دیکھتے ہیں، تو ہمیں محسوس ہوتا ہے، یہ عورت ٹھیک کہہ رہی ہے۔ یہ عورت پاگل نہیں ہے۔ یہ قیامت کی نقیب ہے، جو ہمیں دنیا کے خاتمہ کی خبر دینے آئی ہے۔

کرنل۔ ایسے خیالات کو غالب نہ آنے دو میرے دوستو۔ یہ پست ہمتی ہے، یہ شکست خوردگی ہے۔

آواز ۲۔ لیکن تم بتاؤ، ہم امید کی روشنی کہاں دیکھ سکتے ہیں؟ ہماری تہذیب، ہمارا سماج، ہمارے خاندان سب کچھ تباہ اور تتر بتر ہو چکے ہیں۔ ہم اس تباہی پر صبر کر سکتے تھے۔ راکھ کے ان ڈھیروں کو اپنے خون پسینے سے سینچ کر اس خاکستر وادی کو ایک بار پھر سرسبز بنا سکتے تھے۔ لیکن ہمارے تخلیق کے سوتوں میں زہر گھل چکا ہے۔ ہم انسانوں کے بجائے جانوروں کو جنم دینے لگے ہیں۔ ہم تخلیق کی ازلی اور ابدی مسرت سے محروم ہو گئے ہیں۔

کرنل۔ اتنے ناامید نہ ہو۔ شائد ——— شائد آگے چل کر یہ اثر زائل ہو جائے۔

ایک آواز۔ کب تک؟ کب تک کرنل؟ ہمیں بتاؤ، یہ اثر کب تک زائل ہو جائے گا؟

کرنل۔ شائد ——— شائد اگلے بیس تیس برسوں میں۔

آواز۔ اوہ کرنل۔ اور تب تک ہم ان غیر انسانی شکلوں کو جنم دیتے رہیں گے؟ نہیں، نہیں کرنل، ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ ہم ان بچوں کو مار ڈالیں گے۔

ہم ان کی نسل ختم کر دیں گے ۔

کرنل ۔ نتیجہ ؟ میرے دوستو، تم ان بچوں کو مار دو گے ۔ لیکن ایسے ہی اور بچے پھر پیدا ہو جائیں گے ۔ وہ پیدا ہوتے رہیں گے ۔ تم اس عذاب سے نہ بچ سکو گے جو ایٹم بموں سے نازل ہوتا ہے ۔

آواز ۲ ۔ لیکن پھر ہم کیا کریں ؟ بتاؤ، تم بتاؤ ۔ تم حکومت کے نمائندہ ہو ۔ تم نے ایٹم بم بنائے ہیں (بہت ناامید کے لہجہ میں) ہم کیا کریں ؟

پاگل عورت ۔ اور ایٹم بم بناؤ ۔ ایک نیا پریسیڈنٹ چنو ۔ نئے جنرل بناؤ ۔ اور چوتھی جنگ لڑ ڈالو ۔ پھر سب مسئلے حل ہو جائیں گے ۔ پھر قیامت آنے میں دیر نہ لگے گی ۔ قیامت آنے میں ۔ ہا ہا ہا ۔

(یکایک دور سے کہیں پستول چلنے کی آواز آتی ہے ۔)

آوازیں ۔ یہ کیا ہوا ؟ یہ کیا ہوا ؟

کرنل ۔ گولی چلی ۔ یہ آواز میرے جہاز کے پاس سے آئی ہے ۔

آواز ۱ ۔ کہاں، کدھر ؟

کرنل ۔ اس طرف، تم لوگ میرے ساتھ آؤ ۔

(یکایک سارجنٹ دوڑتا آتا ہے ۔)

کرنل ۔ سارجنٹ، یہ گولی کہاں چلی ! کس نے چلائی ؟

سارجنٹ ۔ میجر نے ۔

کرنل ۔ کس پر ؟

سارجنٹ ۔ اپنے پر ۔ میجر نے خودکشی کر لی ۔

کرنل ۔ کیا ؟ میجر نے خودکشی کر لی ؟

مجمع ۔ خودکشی ؟

سارجنٹ ۔ ہاں کرنل

کرنل ۔ لیکن کیوں ؟

(اُسی وقت نوجوان پاگل عورت داخل ہوتی
ہے۔ اس کے ہاتھ میں میجر کی ٹوپی ہے۔)

ایک آواز ۔ ارے یہ پاگل عورت پھر آگئی۔ یہ اس کے ہاتھ میں کیا ہے ؟

سارجنٹ ۔ اس کے محبوب کی ٹوپی۔

کرنل ۔ یہ کیا کہہ رہے ہو سارجنٹ ؟

سارجنٹ ۔ ٹھیک کہہ رہا ہوں کرنل۔ یہ میجر کی محبوبہ ہے۔

آوازیں ۔ نہیں نہیں۔ یہ تو ہمارے گاؤں کے سب سے خوبصورت آدمی کی بیوی ہے۔

سارجنٹ ۔ ہاں، لیکن پہلے یہ میجر کی محبوبہ تھی، جسے خود میجر چھوڑ کر چلا آیا تھا، تاکہ تمہارے
گاؤں کے سب سے خوبصورت آدمی سے شادی کر سکے۔

کرنل ۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو ؟

سارجنٹ ۔ کرنل، ایک دن تم نے میجر سے تعارف کرایا تھا۔ آج میں اس کا تعارف تم سے
کرا رہا ہوں۔ یہ تمہارے میجر کی محبوبہ ہے، جو ایک پھول اور چاند سے خوبصورت
بچے کا سپنا دیکھا کرتی تھی۔ جس دن میجر کو اس کے اس سپنے کا پتہ چلا، وہ بغیر
کچھ کہے اپنے سینہ پر پتھر رکھ کر چلا آیا ؟

کرنل ۔ مگر کیوں ؟

سارجنٹ ۔ کیونکہ میجر خوبصورت نہ تھا۔ وہ اس عورت کے سپنے کو پورا نہ کر سکتا تھا۔
وہ خود اس کی زندگی سے ہٹ گیا تاکہ اُس کی جگہ ایک خوبصورت آدمی آئے
اور اس عورت کی گود میں ایک حسین کنول کھلا سکے۔ لیکن آج میجر نے اپنے
اس سپنے کی تعبیر دیکھی۔ جس کے لئے اُس نے اپنی محبت اور مسرت قربان کی

تھی، اس کی حسین ترین محبوبہ کی گود میں پھول نہ تھا، چاند نہ تھا، اس کی گود میں تمہارے ایٹم کا شگوفہ، ایک ناقص اور غیر انسانی شکل کا بچہ تھا۔

کرنل۔ اور اس نے خودکشی کرلی؟ اوہ خدا۔

بوڑھی پاگل عورت۔ ہا ہا ہا..... اب خدا کو پکارتے ہو؟ ہا ہا ہا۔ اُسے مت پکارو۔ اسے پکارنے سے کچھ نہ ہوگا۔ اپنے نئے خدا کو پکارو—— ایٹم کو۔ ہا ہا ہا۔

* * * * (پردہ گرتا ہے) * * *

ساتواں منظر

(جنرل کا کمرہ)

جنرل۔ تم اپنے سفر سے بخیر و عافیت واپس آ گئے، کرنل۔ میں تمہیں مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

کرنل۔ (تھکان اور نا اُمیدی سے) شکریہ جنرل۔

جنرل۔ میجر نہیں آیا؟

کرنل۔ نہیں۔

جنرل۔ کیوں؟ کہاں رہ گیا۔

کرنل۔ چلا گیا، ہمیشہ کے لئے۔

جنرل۔ بھاگ گیا، میں جانتا تھا، وہ بزدل ہے، بے ہمت، نکما ہے۔ لیکن میں اُسے اس طرح فوجی قوانین کی خلاف ورزی کر کے بھاگنے نہ دوں گا۔ میں اُسے پکڑوا کر اُس کا کورٹ مارشل کراؤں گا۔

کرنل۔ آپ اُس کا کورٹ مارشل نہ کرا سکیں گے جنرل۔ بہت ہو چکا ہے یہ کھیل۔ اب فوج کو، فوجی قوانین کو اور کورٹ مارشل کو۔ ان سب چیزوں کو بھلا دیجئے۔ میجر ایک پاک اور لطیف رُوح تھا۔ وہ آزاد ہو گیا۔ آپ کے فوجی قوانین سے آزاد۔

جنرل۔ تو کیا وہ —— وہ؟

کرنل ۔ اُس نے خودکشی کرلی ۔

جنرل ۔ اوہ کرنل ۔ یہ تم نے کیا سُنایا ۔ میجر ہمیشہ کے لئے جُدا ہوگیا؟

کرنل ۔ ہاں جنرل میجر نے خودکشی کرلی ۔

(سارجنٹ داخل ہوتا ہے ۔ اسکے ہاتھ میں چمڑے کا تھیلا ہے)

سارجنٹ ۔ Good afternoon, sir (فوجی سلام کی آواز)

یہ آپ کا تھیلا ہے کرنل ۔

کرنل ۔ اوہ شکریہ ۔ اب تم جا سکتے ہو ۔

جنرل ۔ ہاں، سارجنٹ تم بھی بے حد تھک گئے ہو گے ۔ تمہیں اب آرام کرنا چاہیئے ۔

سارجنٹ ۔ Thank you, sir الوداع کرنل ۔

کرنل یہ کیا سارجنٹ؟

سارجنٹ ۔ کچھ نہیں کرنل ۔ بہت دن آپ کے ساتھ رہا ہوں، اس لئے آپ سے الوداع کہنے کو جی چاہ رہا ہے ۔

کرنل ۔ لیکن آج تم ضرورت سے زیادہ اُداس اور مغموم نظر آتے ہو؟

سارجنٹ ۔ نہیں کرنل ۔ مَیں صرف ضرورت سے زیادہ جی چُکا ہوں ۔ الوداع ۔

(چلا جاتا ہے)

جنرل ۔ بڑی عجیب باتیں کرتا ہے تمہارا سارجنٹ ۔

کرنل ۔ ہاں جنرل ۔ اور نہ جانے کیوں آج ایک ساتھ مجھے محسوس ہُوا، جیسے ایک اور فرشتہ ہم کو چھوڑ کر چلا گیا ۔

(ایک ساتھ ہوائی جہاز کے اسٹارٹ ہونے کی آواز)

جنرل ۔ کرنل، سُنو یہ کیسی آواز ! کسی نے تمہارا ایٹم کی طاقت سے چلنے والا جہاز اسٹارٹ کیا ۔

کرنل۔ کہاں؟ ہاں یہ میرے ہی جہاز کی آواز ہے۔

جنرل۔ دیکھو، ہمارے پاس صرف یہی ایٹم کی طاقت سے چلنے والا جہاز رہ گیا ہے۔ کہیں اسے کوئی .....

(اُٹھ کر کھڑکی کی طرف جاتا ہے، یکایک اسے نظر آتا ہے کہ سارجنٹ ہوائی جہاز اُڑا کر لے جا رہا ہے۔)

جنرل۔ کرنل دیکھو، روکو۔ سارجنٹ تمہارا ہوائی جہاز لے جا رہا ہے۔

کرنل۔ (تعجب سے) سارجنٹ؟

جنرل۔ ہاں، وہ لے جا رہا ہے، وہ اڑ گیا، اسے روکو۔ اُسے گولی مار کر گرا دو۔ سنتری، سنتری۔

کرنل۔ کوئی حکم نہ دو جنرل، میجر اور سارجنٹ کی طرح یہ جہاز بھی ہمارے حکم اور ہماری گولیوں کی زد سے باہر ہے یہ ایٹم کا جہاز ہے جس کا تعاقب کوئی نہیں کر سکتا۔

جنرل۔ مگر ـــــ مگر سارجنٹ اسے کہاں لے جا رہا ہے؟ کیا تمہیں اس کے بارے میں کچھ معلوم ہے؟

(یکایک ایک فوجی اندر داخل ہوتا ہے۔)

فوجی۔ سر ـــــ سارجنٹ آپ کے لئے یہ لفافہ دے گئے ہیں۔

کرنل۔ لفافہ؟ ـــــ سارجنٹ؟ ادھر لاؤ؟

(لفافہ چاک کرتا ہے)

جنرل۔ کیا لکھا ہے، اس میں کرنل۔ جلد بتاؤ۔

کرنل۔ سارجنٹ جہاز کو لے کر ہمیشہ کے لئے چلا گیا ہے جنرل۔

جنرل۔ اوہ کرنل، یہ بہت بُرا ہوا، یہ بہت بُرا ہوا۔ ہمارے پاس یہ صرف ایک جہاز تھا۔ دنیا میں اپنے نمونے کا ایک ہی جہاز۔ (یکایک چیخ کر) کرنل کہیں سارجنٹ

جہاز کو لے کر دشمن کے پاس تو نہیں جا رہا؟ وہ دشمن کا ایجنٹ تو نہیں تھا کرنل۔

کرنل۔ جنرل، اعصاب پر خوف غالب نہ ہونے دو۔ دشمن کے اسی خیالی خوف نے ہم کو تیسری جنگ کے شعلوں میں جھونک دیا تھا۔ سارجنٹ دشمن کا ایجنٹ نہیں ہے، کیونکہ اب کوئی کسی کا دشمن نہیں ہے۔

جنرل۔ لیکن پھر وہ جہاز کہاں لے گیا؟ کیوں لے گیا؟ اس نے کیا لکھا ہے؟

کرنل۔ سُن لیجیے جنرل، کیونکہ یہ خط میری نجات سے زیادہ آپکی ذات سے متعلق ہے۔

(خط پڑھتا ہے)

سارجنٹ کی آواز۔ "کرنل، اِس ایٹم کی طاقت سے چلنے والے ہوائی جہاز کو لے کر میں فضاؤں کے پار اس نامعلوم نیلے خلا کی طرف جا رہا ہوں، جہاں سے پکڑ کر تم کبھی مجھے نہ لا سکو گے۔ میں تمہارے لیئے تین جنگیں لڑ چکا ہوں۔ میں نے اِنسان کو اُس جگہ واپس لاکر ہی نہیں پہنچ دیا، جہاں وہ صدیوں پہلے تھا ہوں سے نکل کر انسانیت کے راستہ پر چلا تھا، بلکہ میں نے تخلیق کے سوتوں کو بھی زہریلا کر دیا ہے۔ اب اِنسان پیدا نہیں ہوگا۔ تم اب اِنسان کی پیدائش کے لیئے ترستے رہو گے ...... ایک دن میں نے میجر سے پوچھا تھا "میجر کیا قیامت کبھی ہوگی"؟ اُس نے جواب دیا تھا، اس وقت تک نہیں، جب تک ماں تخلیق کرتی رہے گی۔ خوبصورت پھول کھلتے رہیں گے۔ اور آنکھ دوسروں کے لیئے آنسو بہاتی رہے گی۔ لیکن اب ـــــ کرنل اب نہ ماں تخلیق کرے گی، نہ خوبصورت پھول کھلیں گے، اور نہ آنکھ آنسو بہا سکے گی۔ قیامت جو آنا تھی، آ چکی ہے۔ اس لیئے الوداع کرنل، کہ اب روانگی کی گھڑی آ گئی ہے۔

جنرل۔ (چیخ کر) اوہ، یہ کیا بکواس ہے۔ اسے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالو۔

کرنل۔ نہیں جنرل ـــــ اسے محفوظ کر کے اپنے تہہ خانوں میں رکھ لو، کیونکہ یہ خط

نہیں ہے۔ یہ ہماری تہذیب کی تاریخ کا آخری اور عبرتناک صفحہ ہے۔

* * * (پردہ گر جاتا ہے) * * * *

آٹھواں منظر

(جنرل کا وہی ڈرائینگ روم۔ جنرل بے قراری سے ٹہل رہا ہے کہ
اندر سے ڈاکٹر داخل ہوتا ہے)

ڈاکٹر۔ جنرل

جنرل۔ ڈاکٹر ـــــ ڈاکٹر تم نے ایلن کو دیکھ لیا؟

ڈاکٹر۔ یس جنرل۔ فکر کی قطعی کوئی بات نہیں ہے۔ ان دنوں میں عورتوں کو ایسے ہی درد
اٹھا کرتے ہیں۔ شاید آج شام تک بچہ ہو جائے گا۔

جنرل۔ (خوشی سے) اوہ، شکریہ ڈاکٹر۔ مگر (لہجہ میں یکلخت تردد پیدا ہو جاتا ہے)
مگر ڈاکٹر ایلن کو تو کوئی خطرہ نہیں ہے؟

ڈاکٹر۔ قطعی نہیں جنرل۔ بچہ بالکل نارمل حالت میں ہے۔ اور پیدائش کے وقت کوئی
پیچیدگی پیدا نہ ہوگی۔

جنرل۔ (اطمینان اور تشکر کے لہجہ میں) شکریہ، شکریہ ڈاکٹر۔ آپ تو ایلن کے پاس رہیں
گے نہ؟

ڈاکٹر۔ کیوں نہیں۔ ریڈیو ڈسٹ کے اثر سے بچانے کے لئے جب میں نے زچہ کو اسپتال بھیجنے
کی بجائے گھر ہی میں رکھنے کا مشورہ دیا ہے، تو میں خود بھی یہیں رہوں گا۔ آپ
ان کی طرف سے بالکل بے فکر ہو کر اپنے کام میں مصروف رہیں۔

جنرل۔ شکریہ، ڈاکٹر۔

(ایک نرس اندر سے آتی ہے)

نرس۔ ڈاکٹر ـــــ لیڈی ڈاکٹر آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔

ڈاکٹر۔ اِن سے کہو، مَیں آ تا ہوں۔ اچھا جنرل مجھے اجازت ہے؟

جنرل۔ ضرور۔ ضرور۔ آپ نے میرے دِل سے بہت بڑا بوجھ اُٹھا دیا ہے۔

(ڈاکٹر اندر چلا جاتا ہے۔ کرنل داخل ہوتا ہے)

جنرل۔ آیئے کرنل آیئے۔

کرنل۔ وہ کیسے ہیں؟

جنرل۔ بالکل ٹھیک ہیں۔ ڈاکٹر ابھی ابھی پورا پورا اطمینان دِلا کر گئے ہیں۔ شاید آج شام ہی تک.....

کرنل۔ تب تو مبارک باد جنرل۔ خدا نے چاہا، تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔

جنرل۔ شکریہ کرنل۔ آج شام کے بعد میری روح سے ایک بہت بڑا بوجھ ہٹ جائیگا۔ پھر مَیں پوری طاقت سے اپنی تجویز پر عمل کر سکوں گا۔

کرنل۔ (چونک کر) تجویز پر؟

جنرل۔ ہاں کرنل۔ مَیں نے ایک تجویز بنائی ہے۔ یاد ہے، تم نے بتایا تھا، ملک میں محفوظ علاقہ بہت ہی کم رہ گئے ہیں، اور اسّی فیصدی بچے ناقص پیدا ہو رہے ہیں۔

کرنل۔ ہاں جنرل۔

جنرل۔ اور وہ زندہ ہیں؟

کرنل۔ ہاں، اور جس پیار اور لاڈ پیار سے ماں باپ ان بچوں کو پال رہے ہیں، اُسے دیکھتے ہوئے یہ بھی کہا جا سکتا ہے، کہ وہ زندہ رہیں گے؟

جنرل۔ اور اِس طرح یہ ناقص اِنسانی نسل، بہت جلد اِنسانوں کی پاکیزہ نسل پر حاوی ہو جائیگی۔

کرنل۔ (جھجک کر) ہاں، لیکن یہ ناقص نسل کوئی الگ نسل نہیں ہے جنرل۔ یہ اِنسانی نسل ہی کا حصہ ہے۔

جنرل۔ (زور سے) نہیں (میز پر مکا مارتا ہے) یہ ناقص نسل، پاکیزہ اِنسانی نسل کا

حصہ نہیں ہے۔

کرنل۔ مگر کچھ عرصہ میں آپ دیکھیں گے، کہ جیسے آپ آج پاکیزہ اِنسانی نسل کا حصّہ ماننے سے اِنکار کر رہے ہیں، کل وُہی اِنسانی نسل کا واحد نہیں تو غالب حصّہ ضرور بن جائیگی۔

جنرل۔ ہرگز نہیں، مَیں ایسا ہرگز نہ ہونے دُوں گا۔

کرنل۔ مگر اِسے روکنا آپ کے قابُو کی بات نہیں۔

جنرل۔ یہ میرے قابُو کی بات ہے کرنل۔ مَیں خالص اِنسانی نسل کو اس ناقص و غدار نسل کے اثرات سے محفوظ رکھوں گا۔ تجربات نے ثابت کر دیا ہے کہ اگر ایسے جانداروں کو الگ کر دیا جائے۔ جن پر ریڈیو ڈسٹ کا اثر ہو چکا ہے، تو ہماری پاکیزہ نسل ناقص ہونے سے بچ سکتی ہے۔

کرنل۔ آپ کا کیا مطلب ہے جنرل؟ کیا آپ ایسے بدقسمت لوگوں کو ان کے حال پہ چھوڑ دینا چاہتے ہیں؟ ان کو قانونی طور پہ اچھوت اور حقیر قرار دینا چاہتے ہیں؟

جنرل۔ مَیں، مَیں یہ سب کچھ کرنا نہیں چاہتا۔ مَیں اس سے زیادہ مؤثر قدم اُٹھاؤں گا۔ مَیں ان سب کو گرفتار کراؤں گا۔

کرنل۔ (چونک کر) جنرل۔

جنرل۔ (وحشیانہ سختی سے) ہمارے پاس فوج ہے، ہتھیار ہیں، ہم منظم ہیں مَیں چُن چُن کر ناقص بچوں اور اُن کے والدین کو گرفتار کراؤں گا۔ اور اس کے بعد ان سب کو قتل کرا دُوں گا۔

کرنل۔ (حیرت اور خوف سے) نسلی قتلِ عام؟ جنرل تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو؟

جنرل۔ نہیں کرنل۔ مَیں جذبات کی رَو میں بہہ کر اس فیصلہ پہ نہیں پہنچا ہوں۔ مَیں نے پچھلے چھ ماہ سے اس مسئلہ پہ دن رات غور و خوض کیا ہے، اور مَیں اس نتیجہ پہ پہنچا ہوں کہ مجھے دن بدن کم ہوتی ہوئی پاکیزہ انسانی نسل کو ناقص نسل کے روزافزوں

خطرہ سے بچانا ہوگا۔ اگر میں نے اس وقت ان کا اِنسداد نہ کیا، تو یہ چند ہی سالوں میں اس قدر بڑھ جائیں گے کہ اکثریت میں آجائیں گے۔ جمہوری دستور کے مطابق حکومت ان کے ہاتھ میں چلی جائے گی، اور پاکیزہ اِنسانی نسل ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ان کے تابع ہو کر رہ جائے گی۔ لیکن میں ایسا نہیں ہونے دُونگا۔

کرنل۔ جنرل، تم خیال کی کس خطرناک ڈگر پر چل پڑے ہو؟ تم پھر نسلی منافرت کے راستے پر چل پڑے ہو۔ تم ڈکٹیٹروں کی طرح نسلی برتری کے جنون کا شکار ہو گئے ہو۔

جنرل۔ ہاں، مجھے ایسی جمہوریت نہیں چاہیئے۔ جس میں ایٹم کی یہ داغی نسل، پاکیزہ انسانی نسل کی حاکم ہو۔ مجھے ایسی مساوات قبول نہیں، جو ناقصوں کو پاکیزہ انسانوں کے برابر کا درجہ دے۔ میں ایسی جمہوریت اور مساوات کو بھی ایٹم کے جہنم میں جھونک دُوں گا۔

کرنل۔ (جواب دینے کے بجائے اس کی ذہنی حالت پر رحم کھاتے ہوئے) جنرل، اپنی موجودہ حالت سے عبرت حاصل کرو۔ نسل اور رنگ کی نفرت نے، برتری اور غلبہ کے خوف نے، ہم کو، ہماری تہذیب بلکہ ہمارے نسلی وجود کو بھی موت اور تباہی کے کتنا قریب لاکر ڈال دیا ہے۔ اِنسان کی چار پانچ ہزار پُرانی تاریخ پر نظر ڈالو اور اس سے کچھ سبق لو۔

جنرل۔ (ایک مجنونانہ ضد کے ساتھ) مجھے کچھ نہیں دیکھنا کوئی سبق نہیں لینا کرنل۔ مجھے احساس ہے کہ اخلاقی اعتبار سے میں ایک گھناؤنے فعل کا مرتکب ہو رہا ہوں۔ مجھے بے خطا بلکہ مظلوم لوگوں کا خون بہانا پڑے گا۔ مگر میرا ضمیر صاف ہے۔ میری نیت پاک ہے۔ میں اِنسان کی نسل کو پاکیزہ ہی نہیں، بلکہ کُرۂ ارض پر برقرار رکھنے کے لئے ایک تاریخی قدم اُٹھا رہا ہوں۔ میں اِنسانیت کی عظیم ترین خدمت کر رہا ہوں۔

کرنل۔ تم انسانیت کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک رہے ہو جنرل۔ تمہاری ساری عمر انسانوں کو انتہائے بے دردی سے فنا کرنے کی کارروائیاں سرانجام دینے میں گزری ہے۔ تم نے انسانیت کے ہر مسئلہ کو قصاب کے ہاتھ کے وار سے ہلاک کرنا سیکھا ہے لیکن آج میں تمہیں آگاہ کرتا ہوں کہ جس طرح تین جنگیں لڑنے کے بعد بھی تم دشمن کو، خوف کو، نفرت کو ہلاک نہ کر سکے، اسی طرح اس بار بھی تم کچھ حاصل نہ کر سکو گے۔ تم صرف انسانی نسل کی جڑ کے آخری ریشوں کو کاٹنے میں کامیاب ہو گے۔

جنرل۔ تم پر میجر کی روح حاوی ہو گئی ہے شاید کرنل حقیقت سے آنکھیں ملاؤ۔ اور اگر تمہاری بینائی جواب دے چکی ہے، تو میری آنکھوں سے دیکھو۔ ایک بار جب تمام ناقص بچے اور ان کے والدین ختم کر دیئے جائیں گے، تو یہ قصہ ہمیشہ کے لئے پاک ہو جائے گا۔

کرنل۔ نہتے والدین اور معصوم ناقص بچے تمہارے دشمن نہیں ہیں جنرل۔ تمہاری دشمن ریڈیو ایکٹیویٹی ہے۔ اور یہ اُن کے قتل کے ساتھ ختم نہیں ہوگی۔

جنرل۔ اس کی مجھے پرواہ نہیں۔ اس کا مقابلہ آئندہ آنے والی نسل کرے گی۔ میرا فرض صرف اتنا ہے کہ میں اس ملک میں ناقص نسل کو پاکیزہ انسانی نسل پر پہل اور سبقت حاصل نہ کرنے دوں۔ میں جانتا ہوں ناقص کچھ عرصے تک پیدا ہوں گے۔ مگر اس دوران میں اتنے پاکیزہ انسان بھی پیدا ہو جائیں گے کہ وہ ناقصوں پر قابو رکھ سکیں گے۔ اور ناقص کیونکہ کسی نہ کسی اعتبار سے کمزور اور مجبور ہوں، اس لئے وہ اپنی اکثریت کے باوجود بھی اُن پر غالب نہ آسکیں گے۔

کرنل۔ تم ایک احمق کا خواب دیکھ رہے ہو جنرل۔ تم یہ سادہ سی حقیقت نظر انداز کر رہے ہو کہ باقی تمام دُنیا میں بھی ناقص نسل پیدا ہو رہی ہے۔ کچھ عرصہ

بعد پورا کرۂ ارض ناقصوں سے آباد ہوگا۔ اور جب تمہاری پاکیزہ نسل ان کے ناقص بھائیوں کو ان کے انسانی حقوق سے محروم کرکے ایک کمتر درجہ دے گی، تو ایک اور عالمی جنگ ہوگی، اور ناقص اور پاکیزہ نسل کی یہ عالمی جنگ تمہارے اس خواب کو ہمیشہ کے لئے دفنا دے گی۔

جنرل۔ تم اپنے تخیل سے، ضرورت سے زیادہ کام لے رہے ہو جنرل۔ تمہاری منطق میں کوئی وزن نہیں ہے۔

کرنل۔ جنرل، ایک تباہ کن خیال کا جنون تم پر سوار ہوگیا ہے۔ اس لئے تم نہ حقیقت کا ادراک کرسکتے ہو اور نہ منطق میں صداقت کی جھلک دیکھ سکتے ہو۔ لیکن اتنا تو سوچو، کہ ناقصوں کی یہ نسل ہماری ہی پیدا کردہ ہے۔ ہم نے ایٹمی ہتھیار بنا کر انہیں استعمال کرکے اس زہر کو آزاد کیا ہے، جس نے انسانوں اور حیوانوں ہی کو نہیں، نباتات کو بھی داغدار بنا دیا ہے۔ پھر اس بدبخت نسل سے نفرت کرتے ہیں، اسے غارت کرنے کی تجویز مرتب کرتے ہیں، ہم کس حد تک حق بجانب ہیں؟ جنرل، ہم کو تو تمام عالم موجودات کے سامنے ملزموں کی طرح سرنگوں کھڑا ہونا چاہیئے۔

جنرل۔ کرنل —— تم یہ باتیں اس لئے کہہ رہے ہو کہ تم تنہا ہو، کنوارے ہو۔ جو حقیقت میری نظروں کے سامنے ہے، وہ تمہارے دائرہ بصارت میں آ ہی نہیں سکتی۔ —— تم باپ نہیں ہو۔ لیکن میں باپ بننے جا رہا ہوں۔ آج شام تک کسی بھی گھڑی مجھ پر ایک نئی پاکیزہ انسانی نسل کی ذمہ داری ہوجائے گی۔ اور میں یہ تصور بھی نہیں کرسکتا کہ میرا بچہ اپنے کو ناقصوں کی ایسی دنیا میں پائے، جس میں ان کی اکثریت ہو۔ ان کا غلبہ ہو۔

کرنل۔ (اصل وجہ سمجھ کر) اوہ، اب میں سمجھا کہ انسانیت کے غم میں تم پیغمبروں کی طرح

کیوں گھلے جا رہے ہو۔ پاکیزہ انسانی نسل کے تحفظ کے لئے کیوں رضا کاروں کی طرح مجروح انسانیت کے قتل عام کے درپے ہو۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ چھ ماہ سے کس لئے تم اس مسئلہ پر سر کھپا رہے تھے اور ایٹم کی طرح جلا دینے والی حقیقت کے ادراک سے بھی قاصر تھے۔ جنرل، تمہیں انسانیت کی نہیں، اپنے بچے کے سیاسی مستقبل کی فکر ہے۔ تم اس کو ایک برتر درجہ دلانے کے لئے پوری انسانیت کا خون کرنے پر تُل گئے ہو۔

(پچھلے دروازہ سے ڈاکٹر داخل ہوتا ہے)

ڈاکٹر۔ (لہجہ بہت سنجیدہ ہے) جنرل، مبارکباد کہ تم ایک بیٹے کے باپ بن گئے ہو۔

جنرل۔ (لہجے کی سنجیدگی نوٹ نہ کرتے ہوئے، وفورِ مسرت سے) ایک بیٹے کا باپ! اوہ ڈاکٹر شکریہ۔ بہت بہت شکریہ۔ کرنل سُنا تم نے، مَیں ایک بیٹے کا باپ بن گیا۔ ایک بیٹے کا باپ۔

کرنل۔ بہت بہت مبارکباد جنرل —— یہ بدنصیب اُس کے حق میں دُعا کرتا ہے۔

ڈاکٹر۔ جنرل، تم بھی دُعا کرو، کیونکہ یہ دُعا کا مقام ہے۔

جنرل۔ (چونک کر) دُعا کا؟ کیوں؟ کس لئے؟ تم کیسے کہہ رہے ہو؟ ایلین تو ٹھیک ہے؟

ڈاکٹر۔ وہ بالکل ٹھیک ہے۔

جنرل۔ اور بچہ؟

ڈاکٹر۔ وہ بھی بالکل ٹھیک ہے جنرل۔

جنرل۔ پھر —— پھر کیا بات ہے؟

ڈاکٹر۔ (انتہائی سنجیدہ لہجہ میں) جنرل، تم ایک بہت بہادر سپاہی ہو اور مجھے اُمید ہے کہ اس گھڑی بھی تم اُس بہادری کا ثبوت دو گے۔

جنرل۔ لیکن ہُوا کیا ہے ڈاکٹر ــــــ مجھے بتاؤ ــــــ مجھے فوراً بتاؤ۔ اس سکتہ میں میرا دَم گھٹا جا رہا ہے۔

ڈاکٹر۔ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی ہے جنرل۔ صرف تمہارے ایک ناقص بچّہ ہُوا ہے۔

جنرل۔ (وحشت سے) ڈاکٹر۔

ڈاکٹر۔ ہاں، اور شکر کرو کہ اس کے ماتھے پر صرف ایک سینگ ہے۔

جنرل۔ (اپنے بال نوچ کر) اوہ ڈاکٹر ــــــ یہ مَیں نے کیا سُنا۔ اوہ خدا، یہ کیا ہو گیا (پژمردگی کے لہجہ میں) کرنل۔

کرنل۔ جنرل، زندگی ایک عجیب و غریب چیز ہے۔ کبھی یہ انسان کی نظر سے روشن سے روشن حقیقت کو پوشیدہ کر دیتی ہے اور کبھی پوشیدہ سے پوشیدہ اصلیتوں کو یُوں آنکھوں کے سامنے لاکر کھڑا کر دیتی ہے کہ اس کے عکس سے آنکھوں کے تارے اندھیری رات میں قندیلوں کی طرح چمک اُٹھتے ہیں۔ تمہاری زندگی نے بھی تم کو ایک موڑ سے دُوسرے موڑ پر لاکر کھڑا کر دیا ہے۔ آج جب تم خود ایک ناقص بچّے کے باپ بن گئے ہو تو اس حقیقت سے انکار نہ کر سکو گے، کہ دُنیا کا کوئی بھی حصہ ریڈیو ایکٹی وِٹی کے اثر سے محفوظ نہیں ہے۔ دُنیا کا کوئی انسان اپنی نسل کو ناقص ہونے سے نہیں بچا سکتا۔ اسلئے تم کو یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ ناقص نسل، تمہارے اپنے گناہوں کا پھل ہے، اور اس پھل کو تمہیں بھوگنا ہوگا۔

جنرل۔ لیکن ..... لیکن یہ کیسے ہوگا کرنل یہ مجھ سے کیسے برداشت ہوگا؟

کرنل۔ یہ کچھ زیادہ مشکل نہیں ہوگا جنرل۔ کیونکہ زندگی اپنے اندر ہر زہر کو سمو لیتی ہے آج جسے تم ناقابلِ برداشت سمجھتے ہو، دھیرے دھیرے زندگی اسے قابلِ قبول بنا دے گی۔ تم، ہم سب لوگ اس کے عادی ہو جائیں گے۔ اور ہو سکتا ہے ایک دن ایسا بھی آئے کہ ہماری نسل کو یاد ہی نہ رہے کہ اُن کے

آباؤ اجداد کبھی ان سے مختلف، ایسی شکلوں کے تھے، جو پھول اور چاند
سے مشابہت رکھتی تھیں۔

جنرل۔ (رو پڑتا ہے) اوہ کرنل، یہ ہم نے کیا کر ڈالا۔ اس ایٹم نے ہمیں کہاں سے
کہاں جا پہنچایا۔

کرنل۔ جنرل، اپنے الزام سے بچنے کی کوشش نہ کرو۔ جب ہم نے ایٹم توڑا تھا،
تب اس نے ہم سے نہ کہا تھا کہ میری جہان سوز طاقت سے اپنی سیاسی رقابت
اور نسلی منافرت کی آگ بجھاؤ۔ تم اس کی آگ سے پہاڑوں کے دل پگھلا سکتے
تھے۔ زمین سے اس کے خزینہ اُگلوا سکتے تھے۔ ستاروں اور سیاروں سے ان
کے راز افشا کروا سکتے تھے۔ لیکن اس وقت تم نے یہ سب کچھ نہ سوچا، اور
اب ــــ اب پھر تم اسی راستہ پر جا رہے ہو؟ جنرل اپنی تاریخ کے گزرے
کل سے اُس کل کے لئے سبق لو، جو اتفاق سے بچ رہا ہے۔ اور
اس حال کے بعد آنے والا ہے۔

جنرل۔ (جیسے روشنی دیکھی ہو) کرنل۔

(جنرل گھٹنوں کے بل جھک کر مسیحوں کی طرح اپنے ہاتھ سے
سینہ اور ماتھے کو چھوتا ہے۔ کرنل اور ڈاکٹر اس کے پیچھے
کھڑے ہو کر اسی طرح کرتے ہیں، اور پھر تینوں مُڑ کر سرنگوں تدند
چلے جاتے ہیں، جہاں جنرل کا ناقص بچہ، ان کی زندگیوں
کے سب سے زیادہ تلخ اور عبرتناک سبق کی صورت میں پڑا
چلا رہا ہے۔)

کردار

کشور :- نوجوان انکم ٹیکس افسر ☆ تارا :- کشور کی فیشن پرست بیوی۔
رانی :- تارا کی دولت مند سہیلی ☆ جینت :- رانی کا شوہر۔
گرلش :- ایک انسان جو کمیشن لے کر سب کچھ کر سکتا ہے۔

(ایک متوسط گھرانے کا ڈرائینگ روم۔ کشور کی بیوی تارا، سنگار میز کے سامنے کھڑی جوڑا بنا رہی ہے۔ جب جوڑا بن جاتا ہے، تو وہ مڑ کر اپنے شوہر کے سامنے کھڑی جاتی ہے۔)

تارا۔ دیکھو، آج میں نے نئے فیشن کا جوڑا بنایا ہے۔

کشور۔ (دیکھ کر) بہت خوب۔

تارا۔ اور یہ میرا بلاوز؟ فٹنگ کیسی ہے؟ کیسی لگتی ہوں میں؟

کشور۔ یہ پوچھنے کی بات ہے؟ بھلا تم اچھی کب نہیں لگتیں؟ ہمیں تو تم ہر وقت، ہر حال میں، اچھی لگتی ہو۔

تارا۔ بس تم میری کبھی چیز کی تعریف نہ کرنا۔ یہی کہتے رہنا، مجھے تم ہر حال میں

اچھی لگتی ہو۔

کشور۔ کیوں؟ کیا یہ غلط ہے؟ ارے میرے دل سے پوچھو......

تارا۔ تمہارے دل سے؟ تمہارے دل کے کیا کہنے۔ میں میلے کپڑے میں رہوں، یا بال بکھیرے پھروں ـــــ تمہیں اور تمہارے دل کو کوئی دلچسپی نہیں۔ تم تو یہ چاہتے ہو کہ میں پھوہڑوں کی طرح رہوں۔

کشور۔ اب کیا کیا جائے تارا، کہ تم میری بات کا یقین ہی نہیں کرتیں۔ میں سچ کہتا ہُوں، مجھے تم ہر حال میں اچھی لگتی ہو۔ میں نے کبھی اس بات کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ تم میرے سامنے بن سنور کر آؤ۔ اس رنگ رُوپ کو بھی اگر بناؤ سنگھار کی ضرورت ہے تو......

تارا۔ بس بس، رہنے دو۔ میں تمہارا مطلب خُوب سمجھتی ہُوں۔ میں جانتی ہو تم میری چیزوں کی تعریف کیوں نہیں کرتے (آنکھیں نچا کر) تمہیں ڈر لگتا ہے کہ میں سنگھار کی چیزوں کی فرمائش نہ کر بیٹھوں......

کشور۔ (مجروح ہو کر) تارا۔

تارا۔ (ہنسکر، اِک اُدا سے) کیوں؟ اچھا سچ سچ بتاؤ، یہی بات ہے نہ؟

کشور۔ (سرد آہ بھر کر) پھر تم نے مجھے سمجھا ہی نہیں تارا۔ تم مجھے کبھی نہ سمجھ سکوگی۔

تارا۔ اچھا اب SERIOUS ہو گئے۔ سچ بڑے چالاک ہو۔ میرے مطلب کی بات آگے چلنے ہی نہیں دیتے۔ مجھے ڈرانا اور بہکانا تمہیں خوب آتا ہے۔ چلو اب موڈ ٹھیک کر لو۔ میں کبھی چیز کی فرمائش نہیں کرونگی۔

کشور۔ (سنجیدگی اور گہری ہو جاتی ہے) تارا، کبھی کبھی تم ایسی باتیں کرتی ہو مگر یقین نہیں آتا کہ یہ باتیں تارا نے کہی ہیں۔ کیا تم سچ مچ محسوس کرتی ہو، کہ میں تم سے محبت نہیں کرتا؟ تمہیں بہکاتا ہوں؟

تارا۔ اچھا، اب چھوڑو ان باتوں کو یا خوشامد کرا کے مانو گے؟ لو یہ میرے بلاوز کے بٹن تو لگاؤ۔ میرا ہاتھ پیچھے نہیں جاتا۔

کشور۔ (مسکرا کر) اور کوئی خدمت؟

تارا۔ آہا۔ بہت خدمت کرو گے۔ اب جلدی کرو۔

(کشور تارا کی پشت کی طرف جا کر بٹن لگاتا ہے، اور پھر آئینہ میں عکس دیکھتے ہوئے۔)

کشور۔ دیکھو تو، تمہارے پیچھے آئینہ میں کیسا لگتا ہوں۔ جیسے گلاب کے پیچھے گوبر کا پھول۔

تارا۔ (مسرت سے) پیار اُمڈ رہا ہے!

کشور۔ ارے ہمارا پیار تو اُمڈتا ہی رہتا ہے۔ کوئی مانے نہ مانے۔

تارا۔ اچھا اچھا۔ مان گئے۔ اب جلدی کرو۔ بازار سے بے بی کے لئے کپڑے خریدنا ہیں، اور پھر سینما بھی جانا ہے۔

کشور۔ ہاں ہاں، بازار میں کافی دیر لگ جائے گی۔ چلو، یہ بیگ تم اُٹھا لو۔ بے بی کو میں اُٹھائے لیتا ہوں۔

تارا۔ تانگہ کیوں نہ لے آؤ، بڑی تیز دھوپ ہے۔

کشور۔ لیکن تانگہ سڑک سڑک جائے گا۔ آدھ گھنٹہ میں بازار پہنچائے گا، اور لو کتنی تیز ہے۔ چھوٹے راستہ سے گلی گلی چلیں گے، دس منٹ میں بازار پہنچ جائیں گے۔

تارا۔ اُن گندی بدبودار گلیوں سے؟

کشور۔ اب ان میں بدبو کہاں رہی ہے۔ اب تو پکی زمین دوز نالیاں بن گئی ہیں۔

تارا۔ ہاں، آپ کو تو صاف ہی لگیں گی۔ قصبہ میں جو رہے ہیں عمر بھر۔ میری تو ناک

نشر جاتی ہے، ان میں سے گزرتے ہوئے۔

کشور۔ (بات کو شگفتگی سے برداشت کرتے ہوئے) ہاں بھئی، تمہاری بات اور ہے۔ تم ٹھہری شہروں اور کوٹھیوں میں رہنے والی اور پڑ گئیں ایک معمولی انکم ٹیکس انسپکٹر کے پلے۔

تارا۔ (ذرا جوش سے) انکم ٹیکس انسپکٹر تو معمولی نہیں ہوتے۔ یہ تو آپ خود بنے ہوئے ہیں ایسے، ورنہ اور بھی تو .....

کشور۔ (تیزی سے) اوروں کی بات نہ کرو تارا۔ اُن کی آمدنی کے ذرائع اور ہیں۔ مجھے ان کے راستے پر چلنا منظور نہیں۔

تارا۔ بس تو قصور آپ کا ہے۔ انکم ٹیکس انسپکٹر ہو نیکی شکایت کیوں کرتے ہیں۔

کشور۔ شکایت نہیں کرتا، تمہارے من میں جو بات ہے، اس کا جواب دے رہا ہوں۔

تارا۔ ہم سے تو تنگی نہیں جھیلی جاتی۔ ہم نے یوں دھوپ میں پیدل گندی گلیوں سے گذر کر نہیں جاتا۔

کشور۔ پیدل چلنے اور گندی گلیوں سے گزرنے کا شوق مجھے بھی ہے۔ لیکن اپنی اپنی بساط .....

تارا۔ بس بساط کی بات اُٹھا کر میرے کلے پر نمک نہ لگاؤ۔ میں تم سے تانگے اور موٹر لانے کو نہیں کہتی۔ لیکن یہ میں تمہیں بتادوں کہ آج مجھے بے بی کے لئے پانچ فراک خریدنے ہیں۔

کشور۔ پانچ؟ لیکن اتنوں کی کیا ضرورت ہے؟ اس کے پاس کافی فراک تو ہیں۔

تارا۔ آپ کو تو میرے اور بے بی کے پاس ہمیشہ کافی کپڑے نظر آتے ہیں (قطعیت کے لہجہ میں) لیکن میں اپنے اور بچہ کو ننگا نہیں رکھ سکتی۔

کشور۔ (بات کو آگے نہ بڑھانے کی غرض سے ایک گھٹی ہوئی تلخی کے ساتھ) اچھا اچھا

پانچ ہی لے لینا۔ گھر سے نکل رہی ہو، تو کم از کم ماتھے پر سلوٹیں تو ڈال کر نہ نکلو۔ لوگ دیکھیں گے.....

تارا۔ لوگ میرے ماتھے کی سلوٹیں ہی دیکھتے ہیں، میرے بدن کے یہ معمولی کپڑے نہ دیکھیں گے؛ ماتھے کی سلوٹوں کا خیال آ گیا، لیکن اس بات کا خیال نہ آیا کہ پچھلے چھ مہینے سے وہی پرانی ساڑھیاں بدل بدل کر پہن رہی ہوں۔

کشور۔ تم لڑنا چاہ رہی ہو؟

تارا۔ تم سے؟ پتھر سے سر پھوڑ کر کیا ملتا ہے ——— اس کا ابھی مجھے ہوش ہے۔

کشور۔ (مجروح ہو کر) تارا۔

(اسی وقت دروازہ پر دستک ہوتی ہے۔ کشور دروازہ کی طرف بڑھ کر کیواڑ کھولتا ہے۔ ایک حسین عورت اندر داخل ہوتی ہے۔)

رانی۔ کشور صاحب آپ ہی کا نام ہے؟

کشور۔ جی مجھی کو ———

تارا۔ (آگے بڑھ کر رانی کو دیکھتی اور ایک ساتھ پہچان لیتی ہے) رانی۔

رانی۔ اوہ تارا ——— تم نے مجھے پہچان لیا؟ (آگے بڑھ کر گلے لگ جاتی ہے) اوہ مجھے تو ڈر لگ رہا تھا کہ شاید تم پہچان ہی نہ پاؤ۔

تارا۔ واہ ——— میں تجھے نہ پہچانوں؟ ——— دیکھئے یہ ہیں میری سب سے پیاری سہیلی رانی۔ پورے پانچ سال بعد ملی ہیں۔

رانی۔ (بڑی شوخی سے) لیکن یہ بھی میری محبت ہے کہ اس کا پتہ پانچ سال بعد تو ڈھونڈ نکالا۔ اس نے تو ایک بار بھی کوشش نہ کی، مجھ سے ملنے کی۔

تارا۔ (ذرا ندامت سے) لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ تو اسی شہر میں ہے۔

رانی ۔ اور مجھے کس نے بتایا کہ تُو یہاں ہے ؟ میری محبت تھی ، تو پتہ نکال لیا ۔
کشور (مسکراتے ہوئے) ہاں یہ کمال ہے آپ کا ۔ آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ ہم لوگ یہاں ہیں ؟
رانی ۔ جیجاجی ، یہ دل کی باتیں ہیں ۔ کل یونہی ٹیلی فون ڈائرکٹری دیکھ رہی تھی ۔ کہ انکم ٹیکس ڈیپارٹمنٹ کا صفحہ نکل آیا ۔ اس میں نام دیکھا ۔ کشور کمار مرواہا ۔ فوراً یاد آیا کہ تارا کی شادی کسی مرواہا سے ہوئی تھی ۔ جو انکم ٹیکس انسپکٹر ہیں ۔ بس اپنے منشی جی کو بھیج کر پتہ چلوا لیا ۔ ابھی اس نے آکر خبر دی کہ واقعی آپ کی شادی رائے صاحب کے یہاں ہوئی ہے اور آپ یہاں رہ رہے ہیں ۔ بس کار لی اور آپ لوگوں کو آن پکڑا ۔
کشور ۔ تب تو واقعی آپ کے دل کو ماننا پڑتا ہے ۔ لیکن یہ ہم کھڑے کھڑے کیا کر رہے ہیں ۔ آپ بیٹھئے ۔ تارا برف وغیرہ منگواؤ ۔
رانی ۔ نہیں جیجاجی ——— میں بیٹھنے نہیں آئی ہوں ——— آپ لوگوں کو اپنے یہاں لے چلنے کے لئے آئی ہوں ۔ آپ کہیں جانے کے لئے تیار تھے ؟
تارا ۔ نہیں ——— کہیں خاص نہیں ——— بس ذرا کپڑے لینے تھے ——— موتی بازار سے ۔
رانی ۔ (قدرے حقارت سے) موتی بازار سے ؟ ارے وہاں کپڑے ملتے ہیں کہ کترنیں ملتی ہیں ۔ میرے ساتھ چلو ۔ ٹیلی فون کر کے بنگلہ پہ ہی اپنے ڈریپر کو بلا لوں گی ۔
کشور ۔ دیکھئے ——— آج تو آپ ہمیں معاف کیجئے گا ۔ آج شام کو ہمیں سنیما بھی جانا ہے ۔ اس لئے پھر کسی دن ......
رانی ۔ کس سنیما جانا ہے ؟

کشور۔ راکسی۔ چھ بجے کے شو میں۔

رانی۔ (خوشی سے اُچھل کر) واہ۔ آج تو سارے سِتارے میرے فیور Favour میں ہے۔ میرے سب پروگرام آپ سے مِل رہے ہیں۔ مجھے بھی چھ بجے کے شو میں راکسی جانا ہے۔ بس ساتھ چلیں گے۔

تارا۔ (بُری طرح گھبرا کر) لیکن رانی بات یہ ہے کہ ..... کہ.....

کشور۔ (بڑی خود اعتمادی سے) وہاں ہمارا آپ کا ساتھ بیٹھنا نہ ہو سکے گا۔ ہمارے پاس آگلی سیٹوں کے ٹکٹ ہیں۔

رانی۔ (چونک کر) آپ Lower stall میں بیٹھ کر سنیما دیکھتے ہیں، اور تارا کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی؟ وہاں تو Vulgar آدمی بیٹھتا ہے۔

کشور۔ ہم Vulgar تو آدمی نہیں۔ ہاں عام آدمی ضرور ہیں۔

تارا۔ (سختی سے) کشور ——— (بات کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے بوکھلائے لہجہ میں) رانی، بات یہ ہے کہ..... کہ ان کے خیالات عجیب ہیں۔ کہتے ہیں، عام آدمیوں سے نفرت کیسی؟ سنیما کی اُونچی کلاسوں میں بیٹھ کر بھی تو عام آدمیوں کے سانسوں کی گندی بُو ہمارے پھیپھڑوں میں جاتی ہے۔

رانی۔ عجیب Logic ہے۔ لیکن کوئی بات نہیں ——— ہم نے آپا اور شوہر کے لئے بھی ٹکٹ لئے ہیں۔ ہم انہیں لوئر کلاس میں بٹھا دیں گے۔ آپ ہمارے ساتھ چلئے۔

تارا۔ لیکن رانی پہلے تم تو میرے یہاں بیٹھو۔ تم میرے گھر آئی ہو۔ میں تو کچھ تمہاری خاطرداری ....

رانی۔ تو تُو میری خاطرداری کرنا چاہتی ہے؟ مَیں تیری مہمان ہوں؟

تارا۔ (اور بوکھلا کر) نہیں نہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔ بات یہ ہے......

رانی۔ کہ تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ جیجا جی آپ تو مجھے مہمان نہیں سمجھتے
اس لیئے اُٹھیئے اور چلیئے میرے گھر۔

کشور۔ دیکھیئے رانی جی۔ مَیں آپ کو مہمان ہرگز نہیں مانتا لیکن اتنا تو آپ کو ماننا ہوگا
کہ اگر گرمی میں اپنا آدمی بھی باہر سے چل کر آئے اور وہ ٹھنڈا پانی قبول نہ کرے،
تو اس سے گھر والوں کو خوشی نہیں ہوتی۔

رانی۔ بہت خوب۔ تو لے آیئے جیجا جی وہ ٹھنڈا میٹھا، جس سے آپ کو خوشی ہوتی
ہے۔

کشور۔ شکریہ۔ مَیں ابھی حاضر ہُوا۔

(باہر جاتا ہے۔)

رانی۔ تو بہت خوش قسمت ہے۔ بڑا اچھا handsome (شوہر) پا لیا ہے۔

تارا۔ اور تُو نہیں ہے، جو ایک مل مالک سے بیاہی گئی ہے؟ کیسے ہیں وہ۔ تو
نے تو ہمیں دکھایا بھی نہیں؛ ساتھ کیوں نہ لیتی آئی؟

رانی۔ آ نہیں؛ ارے وہ تو اب نہانے باتھ رُوم گئے ہوں گے۔

تارا۔ اس وقت؟ دو بجے؟

رانی۔ ارے اُن کی کچھ نہ پوچھو۔ اتنے سُست آدمی میں نے زندگی میں کہیں نہیں
دیکھے۔ سو کر اُٹھتے ہیں نو بجے۔ دانت صاف کرتے ہیں دس بجے۔
نہانے کے لیئے کنا مجھے پر تولیہ اور پیر میں باتھ رُوم سلیپر ڈالتے ہیں بارہ
ایک بجے۔ اتوار ہو تو بس کوئی حساب ہی نہیں۔ کہتے ہیں وقت دُنیا کا خون
کرتا ہے۔ مَیں وقت کا خون کرتا ہوں۔

تارا۔ بھئی انہیں جلدی کرنے کی کیا ضرورت؟ ان کے لئے جلدی کرنے اور بھاگ دوڑ کرنے والے اور بہتیرے ہیں۔ ہمارے یہ بیچارے وقت پر نہ اُٹھیں تو گھر کا کام کیسے چلے؟ صبح اُٹھتے ہیں، دودھ سبزی لانے ....

رانی۔ ارے ڈیری والا تمہارے یہاں دودھ نہیں دے جاتا؟ یہاں تو ڈیری والے خود گھر پر دودھ سپلائی کرتے ہیں۔

تارا۔ یہ کہتے ہیں۔ ہم نہیں خریدیں گے، وہ مہنگا دیتے ہیں۔

رانی۔ ایسا خاص مہنگا تو نہیں دیتے۔ گھر پر بند بوتل صرف دو آنہ مہنگی دیتے ہیں۔ کیا دو آنہ پونڈ کچھ زیادہ مہنگا ہوتا ہے۔

تارا۔ (عجلت سے) نہیں ایسا مہنگا تو نہیں ہوتا۔ لیکن رانی ان کی کچھ عجیب بات ہے۔ اشرفیاں لٹاتے ہیں، کوئلوں پر مہر لگاتے ہیں۔ ویسے اِتنا خرچ کر دیتے ہیں، پر چھوٹی چھوٹی باتوں پر .... بس کچھ پہلی اپنے گھر کی عادت ہے۔

رانی۔ ویسے بُری عادت نہیں۔ جینت تو قطعی پرواہ نہیں کرتے، لیکن میں کرتی ہوں۔ جب نوکر پھل خریدنے جاتا ہے، تو میں خود کار لے کر جاتی ہوں۔ اور کار میں بیٹھی دیکھتی رہتی ہوں کہ وہ یا دکاندار کوئی گڑ بڑ تو نہیں کرتا۔ اِسی طرح ہر مہینے کچن کا سامان لینے بھی میں خود کار لے کر جاتی ہوں۔

(کشور سوڈے کی بوتلیں لئے اندر داخل ہوتا ہے)

رانی۔ (مذاق کرتے ہوئے) تو آپنے کو خوش کرنے کا بندوبست کر لائے! لایئے مجھے بوتل دیجئے۔

کشور۔ لیجئے ـــــــ اور میں شکر گزار ہوں کہ آپ نے اس بات کا موقع دیا....

رانی۔ لیکن اب آپ بھی تو جلدی سے تیار ہو جایئے، تاکہ مجھ کو بھی یہ خوشی حاصل کرنیکا

موقع ملے۔

تارا - ہاں ہاں - آپ بھی تو کپڑے بدل آیئے۔

کشور - کپڑے؟ کپڑے تو میں نے ابھی بدلے تھے۔

تارا - وہ کوٹ اور ٹائی -

کشور - بس بھئی یہ کام مجھ سے نہ ہوگا - رانی جی، آپ ہی انصاف کیجئے کہ اس گرمی میں کسی آدمی کو کوٹ پہننے اور ٹائی لگانے کے لئے مجبور کرنے سے بڑی کوئی سزا ہو سکتی ہے؟

رانی - نہیں تارا - آج کل تو صرف قمیض اور پینٹ پہننا ہی فیشن ہے - یہ کوٹ اور ٹائی تو دوائیاں بیچنے والے ایجنٹ لگاتے ہیں -

تارا - لیکن وہ سِلک کی ریڈی میڈ قمیض تو پہن آیئے، جو میں اپنے یہاں سے لائی تھی ــــ یا وہ بھی کچھ تکلیف دیتی ہے؟

کشور - مجھے سوائے تکلف اور ظاہرداری کے کوئی چیز تکلیف نہیں دیتی تارا -

رانی - ارے بھئی، آپ تو بحث کرنے لگے - تارا، جیجاجی اس شرٹ ہی میں بہت اچھے لگتے ہیں - جیجاجی، آپ کپڑے نہ بدلیئے، لیکن جلدی ضرور کیجئے -

کشور - لیجئے ــــ میں ابھی اندر سے کھڑکیاں وغیرہ بند کرکے آتا ہوں -

(کشور جاتا ہے)

رانی - اور سنا ؟ شادی کو اتنے دِن ہوئے، کچھ بتایا ہے کہ اکیلی ......

تارا - نہیں نہیں ــــ ایک بچی ہے ــــ دو سال کی -

رانی - (بڑے شوق سے) کہاں ہے ؟ اِتنے دیر سے بتایا کیوں نہیں ؟ اندر ہے؟

تارا - ہاں ــــ سو رہی ہے ــــ ابھی لاتی ہوں -

(اندر جاتی ہے اور بچی کو لے کر آتی ہے)

تارا۔ یہ رہی تمہاری بیٹی۔
رانی۔ (بڑے شوق سے اُٹھ کر بچی کو گود میں لیتے ہوئے) ارے دیکھوں اپنی بیٹی کو۔
اوہ کتنی Sweet، کتنی پیاری۔ اوہ مائی سویٹ ڈارلنگ۔ (بچی
کو بڑے پیار سے چومتی ہے)

(کشور اندر سے آکر)

کشور۔ چلئے رانی جی ——— اب ہم آپ کے اختیار میں ہے۔
رانی۔ اوہ شکریہ۔ چلئے۔
تارا۔ لاؤ بے بی کو مجھے دے دو۔
رانی۔ کیوں؟ کیا یہ تیری ہی بیٹی ہے؟ میری نہیں؟ ——— ایڈیٹ کہیں کی۔

(شوخی سے ایڈیٹ کہہ کر مسکراتی باہر چلی جاتی
ہے۔ تارا اور کشور پیچھے پیچھے جاتے ہیں۔)

(پردہ گرتا ہے)

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

دوسرا منظر

(تارا اور کشور کا وہی ڈرائنگ روم)

تارا۔ آپ نے دیکھا، میری سہیلی کو؟ اتنی امیر ہونے پر بھی غرور نام کو نہیں ہے۔
کشور۔ ہاں غرور نہیں ہے۔ صرف Sophistry ہے۔ ویسے کافی خوبصورت ہے۔
تارا۔ شادی سے پہلے تو اتنی خوبصورت نہ تھی.......
کشور۔ مگر اب تو لگتی ہے۔ نقش بہت اچھے نہیں ہیں، مگر رنگ صاف ہے۔ دراصل
شادی کے بعد ہی عورت کی خوبصورتی مکمل ہوتی ہے۔ انگ انگ بھر جاتا ہے۔

تارا۔ (ایک نامعلوم سی اُداسی اور رشک سا اُبھر آتا ہے) کالج کے دِنوں میں تو یہ مجھے کہا کرتی تھی۔ آ تارا جسم بدل لیں۔ تو مجھے اپنے بازو، اپنی اُنگلیاں، اپنی کمر دے دے ___ مگر اب (گہرا سانس لے کر) باڈی سنوار کر رکھنے کی بات ہے۔

کشور۔ ہاں یہ تو ہے۔ جب کرنے کو کام نہ ہو، محنت کرنے کے لئے بہت سے نوکر چاکر ہوں، تو وقت کا ایک ہی استعمال رہ جاتا ہے ___ باڈی سنوار کر رکھنا۔

تارا۔ اچھا تو ہے، اپنا جسم سنوار کر رکھے۔ اُس کی خوبصورتی بنائے رکھے۔ رانی سچ مچ رانیوں کی طرح رہتی ہے۔ کار۔ بنگلہ، نوکر، پارٹیاں۔ میں نے اُس کے سونے کا کمرہ دیکھا، کپڑوں کی الماریاں دیکھیں۔ ریشم ہی ریشم بھرا پڑا تھا۔

کشور۔ تم نے اُس کی تجوریاں نہیں دیکھیں۔ وہ بھی بلیک مارکیٹ کے روپے سے بھری پڑی ہونگی۔

تارا۔ (اپنی ہی رو میں) کبھی اس کی اُنگلیاں بڑی موٹی، بھدّی اور چھوٹی ہوا کرتی تھیں۔ لیکن اب لمبے لمبے پالش کئے ہوئے ناخنوں کی وجہ سے کتنی خوبصورت لگتی ہیں۔ بار بار میرے سامنے اپنا ہاتھ رکھ کر نمائش کر رہی تھیں۔

کشور۔ ان لوگوں کی اور سب بھوکیں مٹ جاتی ہیں، مگر نمائش کی بھوک بدستور بنی رہتی ہے، بلکہ بڑھ جاتی ہے۔ لیکن روپ رنگ میں وہ تمہارا کہاں مقابلہ کریگی؟

تارا۔ میرا مقابلہ؟ رُوپ رنگ میں؟ (جذباتی ہوکر) کہاں باقی رہا ہے۔ میرا رُوپ رنگ سب تو تمہارے چُولہے چوکے کی بھینٹ چڑھ چکا ہے۔ جیسے اس کے تلوؤں کا رنگ ہے، ویسا میرے چہرہ کا ہوگیا ہے۔ مجھ میں اب رہا کیا ہے۔ (رو پڑتی ہے)

کشور۔ تارا، یہ کیا؟ ...... یہ کیا پاگل پن...... آج تم اپنے کو ایک ساتھ اتنا

چھوٹا سمجھنے لگی ہو؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟

تارا۔ (رو کر اندر جاتے ہوئے) کچھ نہیں ——— میں لُٹ گئی ہوں۔ میں بہت بڑی طرح لُٹ گئی ہوں۔

(تارا اندر بھاگ جاتی ہے۔ کشور اس کے
پیچھے پیچھے جاتا ہے۔)

* * * * * * * * * * *

تیسرا منظر

(رانی کا شاندار ڈرائینگ روم)

تارا۔ اور تُو دن بھر کیا کرتی ہے؟ نوکروں پر حکم ہی چلاتی رہتی ہے یا......

رانی۔ بھئی سچ یہ ہے کہ شادی کے دو تین مہینے بعد تک تو کھانا، پینا، سونا، سیر و تفریح ہی رہی۔ پھر زندگی کچھ بور ہونے لگی۔ وقت کٹتا ہی نہ تھا۔ لیکن اب تو میری لائف (Life) بڑی active ہے۔ دیکھ صبح گیارہ بجے سوشل سینٹر میں Hygiene پر لیکچر دینے جاتی ہوں۔ بارہ بجے سے ایک بجے تک ہم مسز رینا، رینا موٹرز کے پروپرائیٹر ہیں نا ——— کے یہاں کاغذ کے پھول بناتی ہیں!

تارا۔ کاغذ کے پھول؟

رانی۔ ہاں، ہاں۔ انہیں خاص موقعوں پر بیچ کر ہم چندہ اکٹھا کرتی ہیں ——— شام کو ہم ایک Refreshment Room میں چلی جاتی ہیں۔ جہاں راشن کے اناجوں کو چھوڑ کر دوسرے اناجوں سے چیزیں تیار ہوتی ہیں۔ تجھے معلوم نہیں، پچھلے دنوں پرائم منسٹر وہاں آئے تھے۔ ہمارے کام کی بڑی تعریف کی تھی۔ ان کے ساتھ

ہماری تصویر بھی اخباروں میں چھپی تھی۔

تارا۔ پرائم منسٹر کے ساتھ؟

رانی۔ ہاں، ابھی ایک Recept پر ہم نے پریذیڈنٹ اور ڈپلومیٹک کور کو بُلایا تھا۔ ہم نے پیلسٹائن کے عرب بچّوں کے لئے کھلونے بھیجے تھے۔ یونی کیف Unicef کی معرفت۔

تارا۔ ارے۔

رانی۔ اور فلیگ ڈے، ہیلیتھ ڈے اور تالا ورڈے پر ہم ہزاروں روپے اکٹھے کر کے دیتی ہیں، اور ہاں اب تو میں ایک امریکی اخبار کو بھی Contribute کرنے لگی ہوں۔

تارا۔ تو اخباروں میں بھی لکھنے لگی ہے؟

رانی۔ ہاں، ہر مہینہ میں اس امریکی اخبار کو Indian Dishes. کا Recipe یعنی بنانے کا طریقہ لکھ کر بھیجتی ہوں۔

تارا۔ (حیرت بھرے لہجے میں) تُو نے تو اپنی زندگی بنا لی۔

رانی۔ اور تو خواہ مخواہ بڑھیا بن کر بیٹھ گئی؟ ارے تجھ میں کیا کمی ہے؟ اسکول میں تو مجھ سے زیادہ Smart اور Intelligent تھی۔ میں ماسٹر سے لکھوا کر میگزین میں آرٹیکل (Articles) چھپواتی تھی۔ مگر تو تو خود اتنا اچھا لکھتی تھی ———— نہ جانے گھر کے دھندوں میں تُو نے اپنے کو اتنا کیوں پھنسا لیا۔ جیجا جی تو بڑے Progress Ideas. کے معلوم ہوتے ہیں۔ اب تو میرے ساتھ چلا کر۔ جہاں جاؤں گی۔ تجھے ساتھ لے کر جاؤں گی۔

تارا۔ مگر بے بی کو لے کر کہاں کہاں جا سکتی ہوں؟

رانی۔ کیوں، آیا کے پاس چھوڑ ———— (پھر یاد کر کے کہ اس کے پاس آیا نہیں ہے)

میری آیا کو تو کوئی کام نہیں۔ حرام خور بس میرے Pomeranian کی پیٹھ سہلایا کرتی ہے۔ وہ بے بی کو سنبھال لیا کرے گی۔

(گرلیش داخل ہوتے ہی دروازہ سے آواز لگاتا ہے)

گرلیش۔ نازنیں ہوشیار باش کہ ڈان جواں داخل ہوتا ہے)

رانی۔ (ہنستے ہوئے) اوہ گرلیش

گرلیش۔ (تارا کو دیکھ کر ڈرامائی انداز میں) ار...ر...ر یہ چاند کے پہلو میں تارا؟

رانی۔ اوہ سچ مچ کا تارا (ہنستے ہوئے) تارا یہ ہمارے یہاں کے سب سے عجیب و غریب جانور ہیں۔

(تارا ہنسی دبانے کی کوشش کرتی ہے)

گرلیش۔ نہ...نہ...نہ مسکراہٹ روکنے کی کوشش نہ کیجئے تارا دیوی مسکرایئے اور اپنے ان موتیوں سے دانتوں کو ان سرخ سرخ ہونٹوں کے درمیان جگمگانے دیجئے۔ (گہرا سانس لے کر، اپنا ہیٹ ہاتھ میں لے کر اور گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے) میں وہ جانور ہوں، جو خوبصورتی کا پجاری ہے۔ تارا دیوی میں فرانسیسی کہانی کا وہ شہزادہ ہوں، جو جانور کے بھیس میں اس لمحہ کا منتظر تھا، جب کوئی سندر راجکماری آئے، اور اپنے ہونٹوں سے.....

رانی۔ بس بس بس.....اپنے گھٹنوں سے اٹھ جایئے اور ہیٹ سر پہ رکھ لیجئے، کیونکہ یہ وہ راجکماری نہیں ہیں ——— یہ مسز.....

گرلیش۔ (غشی کی ڈرامائی کیفیت کے ساتھ) مسز؟ تارا دیوی، آپ نے یہ کیا ظلم کیا؟ تھوڑا اور انتظار کر لیا ہوتا۔ مائی گاڈ ——— میں ہر جگہ دیر سے پہنچتا ہوں۔ رانی تمہارے جینٹ کا اور میرا معاملہ بالکل الٹ ہے۔ وہ تو وقت کا خون کرتا۔

ہے۔

رانی۔ لیکن وقت تمہارا امتحان کرتا ہے۔

(سب ہنستے ہیں)

رانی۔ بھئی دیکھو، یہ ہیں تارا۔ میری کالج کے زمانہ کی دوست۔ آج پانچسال بعد ملی ہیں، اور بھئی یہ ہیں گریش۔ ایکسپورٹ امپورٹر۔ کمیشن ایجنٹ، بزنس، ریپریزینٹیو بیمہ ایجنٹ، اور نہ جانے کیا کیا۔ بس ہم تو یہ جانتے ہیں، کہ جو کام کسی سے نہ ہو، انہیں کمیشن دو، اور کرالو۔ بڑے زندہ دل آدمی ہیں۔

تارا۔ وہ تو ان کی باتوں سے ظاہر ہو گیا۔ آپ بیٹھئے نا!

گریش۔ شکریہ، لیکن اس وقت بیٹھوں گا نہیں۔ صرف آپ کی شام میں بُک کرنے آیا ہوں۔ چار بجے کے بعد آپ کے تمام Engagements کینسل۔

رانی۔ خیر تو ہے؟

گریش۔ بس چار بجے چائے، چھ بجے سینما، نو بجے ڈنر۔ اس کے بعد آپ کے جہاں سینگ سمائیں، آپ جا سکتی ہیں، اور ہاں تارا دیوی، آپ کے لئے Invitation نہیں ہے۔ حکم ہے۔

تارا۔ لیکن یہ سب کچھ کس لئے؟

گریش۔ اس لئے کہ آپ سے پہلی بار ملاقات ہوئی ہے۔ ٹاٹا۔

(ہنستا ہوا چلا جاتا ہے۔)

رانی۔ عجیب آدمی ہے۔

تارا۔ بڑے مزے کا آدمی ہے۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖

چوتھا منظر

(تارا اور کشور کا کمرہ)

تارا۔ کشور بھلا تم کیوں نہیں آئے۔ سچ پارٹی میں بڑا لطف رہا۔
کشور۔ بھئی، میں نے تمہیں ٹیلیفون پر بتا دیا تھا کہ مجھے دو بڑے کیس نپٹانے ہیں۔ آٹھ سے پہلے فارغ نہ ہو سکوں گا۔
تارا۔ گریش، جس کے یہاں دعوت تھی، بڑے مزے کا آدمی ہے۔ ساری پارٹی کو ہنسا کر لٹا دیا۔
کشور۔ چلو اچھا ہوا۔ تمہاری طبیعت بہل گئی ورنہ تم زندگی سے کچھ اکتا گئی تھیں۔
تارا۔ ہاں زندگی تو اُن کی ہے۔ کسی کے ماتھے پر سلوٹ نظر نہیں آتی۔ ہر آدمی کا چہرہ جگمگاتا ہے۔
کشور۔ فرصت ہو، دولت ہو، فکر نہ ہو۔ چہرہ اپنے آپ جگمگانے لگتا ہے۔
تارا۔ نہیں، یہ تو دل کی بات ہے۔ اب وہاں ایک چوپڑہ صاحب آتے ہیں۔ کسی دفتر میں ہیڈ کلرک ہیں، مگر ٹھاٹھ دیکھو۔
کشور۔ ہیڈ کلرک کی تنخواہ میں ٹھاٹھ کر لیتے ہیں؟
تارا۔ ہاں۔ دل میں جو اُمنگ ہوئی۔
کشور۔ نہیں تارا ـــــ رگوں میں رشوت کے خون کی ریل پیل جو ہوئی۔
تارا۔ اچھا، چلو، ہوئی۔ میری بات کا مزا کرکرا نہ کرو۔ ہاں تو بڑا مزا آیا۔ گریش صاحب نے چوپڑہ صاحب کا وہ اُلّو بنایا، وہ اُلّو بنایا کہ توبہ ـــــ اور بھئی شکل و صورت سے ہیں بھی وہ اسی لائق۔
کشور۔ اور مسز چوپڑہ کافی خوبصورت ہوں گی؟

تارا۔ ہاں۔ ان کی تو لوگ بڑی عزت کرتے ہیں، بلکہ انہیں کی وجہ سے لوگ چوپڑہ صاحب کو پارٹیوں میں بُلاتے ہیں، ورنہ......

کشور۔ ایسے گدھوں کو کون گھاس ڈالتا ہے۔ تارا دراصل بڑے آدمیوں کو دو چار ایسے گدھوں کی ضرورت ہوتی ہے، جن کی بیویاں خوبصورت، اور عزت سستی ہو۔

تارا۔ بس، تم تو ہر اُس آدمی سے نفرت کرتے ہو، جو ہنستا ہے، خوش رہتا ہے۔

کشور۔ نہیں، میں صرف اُس آدمی سے نفرت کرتا ہوں، جو دوسروں کی ہنسی خوشی چھین کر ہنستا اور خوش ہوتا ہے۔

تارا۔ کون چھینتا ہے، اور کس کی ہنسی خوشی چھینتا ہے؟

کشور۔ جینت، گریش اور چوپڑہ جیسے لوگ! اور یہ ہماری تمہاری ہنسی خوشی چھینتے ہیں۔

تارا۔ کب چھیننے آئے یہ تمہاری خوشی؟

کشور۔ اس کے لئے اُن کے آنے کی ضرورت نہیں۔ آج کل ڈاکہ مارنے کے لئے نقاب چڑھا کر پستول دکھانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بِل کے کرسے اور دکان کے ایک کونے سے یہ کام زیادہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ جانتی ہو، جو کپڑے ہم پچھلے سالوں میں بلیک مارکیٹ سے خریدتے رہے ہیں، وہ کس کی مِل کے بنے تھے؟ وہ رانی کے شوہر جینت کی مِل کے تھے! ہمارے سکّے دکانداروں کی معرفت اس کی تجوری میں پہنچتے رہے ہیں! ہمارے چہروں کی زردی کا اس کے اور رانی کے چہرہ کی سُرخی سے گہرا تعلق ہے۔ لیکن تم نہیں سمجھ پاؤ گی۔ (گہرا سانس لے کر) آج میرے سر میں بہت شدید درد ہے۔ سہلا دو گی؟

تارا۔ بیٹھ جاؤ...... ارے ماتھا گرم ہو رہا ہے!

کشور۔ بس تھکان ہے ـــــ تھوڑی سی دیر بال سہلا دو جی ۔۔۔۔۔۔ سب ٹھیک ہو جائے گا ۔

(چند سیکنڈ کا وقفہ)

تارا۔ (بڑی محبت سے) آپ اتنا کام کیوں کرتے ہیں ؟

کشور۔ کیا کروں! لوگوں نے بلیک مارکیٹ سے اتنا کمایا ہے کہ نوے فیصد کھاتوں میں چھپائی ہوئی آمدنی ہے۔ اس آمدنی کو پکڑنے کے لئے بڑا مغز کھپانا پڑتا ہے ۔

تارا۔ (کچھ عجیب سے لہجہ میں) نہ کھپایا کرو۔ کیس چھوڑ دیا کرو ؟

کشور۔ ویسے ہی ؟

تارا۔ (بالواسطہ لہجہ میں) کچھ لے لیا کرو ۔

کشور۔ رشوت ؟

تارا۔ دنیا لیتی ہے ۔

کشور۔ تارا ـــــ شہر میں طاعون پھیل جائے تو کیا ہر تندرست آدمی پر لازم ہے کہ وہ اپنے بھی گلٹی نکال لے ؟ کچھ لوگ رشوت لیتے ہیں تو کیا میں بھی ایمان بیچ دوں ؟ اور جانتی ہو اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ انکم ٹیکس سے بچکر وہ اور بے فکر ہوکر بلیک مارکیٹ کریں گے۔ چیزیں اور مہنگی ہوں گی ہمیں اور زیادہ پیسے بلیک مارکیٹ میں خرچ کرنے ہوں گے۔ ان سے رشوت لے کر ہم اپنے ہی دشمنوں کے ہاتھ مضبوط کریں گے ۔

تارا۔ یہ محض ایک خیال ہے۔ جب تک کچھ نہیں لیتے، تب تک ہی ستاتا ہے۔

کشور۔ ہاں پھر خیال مر جاتا ہے ۔

تارا۔ پر آدمی تو جی جاتا ہے۔ ترس ترس کر تو نہیں مرتا۔

کشور۔ (چونک کر) تارا ——— (ٹھہر کر) تم میرے ساتھ خوش نہیں ہو۔
تارا۔ مجھ سے اس گھٹن میں نہیں جیا جاتا۔
(رو پڑتی ہے)

* * * * * * * * *

پانچواں منظر

(تارا اور کشور کا کمرہ)

تارا۔ آج مجھے جلدی جانا ہے۔
کشور۔ کیوں؟
تارا۔ آج فلیگ ڈے ہے۔ رانی کے ساتھ فنڈ اکٹھا کرنے جانا ہے۔
کشور۔ اوہ
تارا۔ کھانا آج ہوٹل سے کھا سکیں گے؟
کشور۔ ضرور، تم فکر نہ کرو۔ بے بی کو ساتھ لے جاؤ گی؟
تارا۔ نہیں، رانی کی آیا کو سونپ دوں گی۔ اس کے پاس رہ جاتی ہے۔ میں نہا آؤں۔ اس کی کار لینے آئے گی۔
(کار کا ہارن سنائی دیتا ہے)
تارا۔ ارے کیا کار آ گئی؟ ابھی سے ——— دیکھئے۔
(کشور کھڑکی سے نیچے جھانکتا ہے)
کشور۔ یہ رانی کی کار نہیں، کوئی اور صاحب آ رہے ہیں۔
تارا۔ اور صاحب؟ دیکھوں ——— ارے گریش صاحب ——— اور میری ساڑھی
...... اور بال ....

(گریش داخل ہوتا ہے)

گریش۔ نمستے تارا دیوی۔

تارا۔ اوہ گریش صاحب۔ معاف فرمائیے میں تو ابھی تیار بھی نہیں..... آپ سے ملئے۔ آپ میرے پتی کشور کمار۔.....

گریش۔ نمستے کشور بابو...... (حافظہ پر زور ڈالتے ہوئے)......ک.... کشور کمار آپ انکم ٹیکس ڈیپارٹمنٹ میں تو نہیں ؟

کشور۔ آپ کا خیال بالکل درست ہے۔ میں وہاں انسپکٹر ہوں۔

گریش۔ اور غالباً "اے" سرکل میں ؟

کشور۔ جی۔

گریش۔ دیکھئے تارا دیوی۔ ہم نے آپ کو تعارف کرانے کی تکلیف نہیں دی۔

تارا۔ آپ کا کیا ہے۔ رانی نے رات ٹھیک ہی کہا تھا۔ آپ اس شہر کی ڈائرکٹری ہیں۔ آپ کو تو Intelligence Department میں ہونا چاہیئے تھا، کسی اونچی جگہ پر۔

گریش۔ عزت افزائی کا شکریہ۔ لیکن باتیں پیچھے، پہلے بوہنی بٹہ کیجئے۔

تارا۔ بوہنی بٹہ ؟

گریش۔ جی، آج فلیگ ڈے ہے۔ اپنے چندہ کا ڈبہ لیجئے اور میری بوہنی کیجئے۔ بزنس مین ہوں، بوہنی بٹہ میں یقین رکھتا ہوں۔

تارا۔ اوہ، ہو (ہنستی ہے) آپ کو کتنا خیال ہے۔ لیجئے ابھی لائی۔ (جاتی ہے)

کشور۔ آپ تشریف رکھئے۔

گریش۔ شکریہ کشور بابو۔ مگر اپنی تقدیر میں بیٹھنا نہیں لکھا۔ زندگی ہمیں چکر دیتی ہے اور ہم اسے چکر دیتے ہیں۔ اپن کا تو قول یہ ہے۔ کہ یا تو تم زندگی کو ٹھنگی

مار کر گرا دو یا زندگی تمہیں ٹنگڑی مار کر گرا دے گی۔ اس لئے ہر وقت
چوکنّا رہنا پڑتا ہے۔

کشور۔ مگر اب تو میرا خیال ہے، زندگی ہی آپ سے چوکتی رہتی ہوگی۔

گریش۔ (قدرے کھسیانہ ہوکر) بہت خوب، بہت خوب۔

(تارا اندر آتی ہے)

تارا۔ آئیے گریش صاحب، آپ کے فلیگ لگا دوں۔

گریش۔ زہے نصیب ——— یہاں ——— شکریہ ——— لائیے اپنا بٹن۔

تارا۔ (چونک کر) یہ کیا؟ پچاس روپے کے نوٹ!

گریش۔ تارا دیوی بھاگوان کی پوجنی بھاگوان ہی کرتا ہے۔

تارا۔ اوہ شکریہ، آپ کے لئے چائے لاؤں؟

گریش۔ نہ ...... نہ .... نہ تارا دیوی۔ آج نہیں۔ آج آپ کی چائے نہیں پئیں گے۔
ہم تو ایک پوری پارٹی لیں گے۔ بے بی کے جنم دن پر۔

تارا۔ مگر وہ تو اگلے مہینے ہوگی۔

گریش۔ بس تبھی۔ اب اجازت۔ اچھا کشور صاحب۔

تارا۔ لیکن چائے......

گریش۔ شکریہ ——— تارا دیوی، آج فلیگ ڈے ہے، اور آپ کو دیر ہو رہی ہے۔
ٹاٹا۔ ٹاٹا۔

(چلا جاتا ہے)

تارا۔ کتنا بے تکلف ہے، خوش مزاجی تو کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔

کشور۔ ہاں ——— جانتا ہے۔ بازار میں کونسا مال چلتا ہے ——— پرنس نین
چد ہوا۔

چھٹا منظر

(رانی کا ڈرائینگ روم)

رانی۔ بھئی لطف آگیا۔ تو نے تو کمال کر دیا۔

تارا۔ کیوں، کیا کمال کر دیا؟

رانی۔ ارے تیرے Collection ہم سے زیادہ ہیں۔ تو تو چھپی رستم نکلی۔

تارا۔ بھئی ہمیں کیا آتا ہے۔

رانی۔ ارے آتا وانا سب کچھ ہے۔ بس تو گھر کی ہو کر رہ گئی تھی۔ دیکھ آج تو نے ڈھنگ سے میک اپ کیا ہے۔ میری پسند کی ساڑھی پہنی ہے! دیکھ کیا سمارٹ شکل نکل آئی ہے۔

تارا۔ مگر گھر میں تو روز جھگڑے ہوتے ہیں۔

رانی۔ کس بات پر؟

تارا۔ میرے باہر جانے پر..... سمارٹ رہنے پر۔

رانی۔ کیوں؟ کشور صاحب اتنے دقیانوسی خیالات کے ہیں؟ انہیں کیا اعتراض ہے۔ اگر تم اپنی لائف بناتی ہو؟ بعض لوگ بھی عجیب ہوتے ہیں۔ یہ چوپڑہ صاحب ہیں نہ اپنے! پہلے انہیں بھی بڑی چڑ تھی اس بات سے۔ مسز چوپڑہ کو باورچن اور کہارن بنا کر رکھ رکھا تھا۔ جب مسز چوپڑہ باہر آنے جانے لگیں، تو شروع میں بہت تلملائے۔ لیکن ایک دن انہیں کے تعلقات کی وجہ سے کلرک سے ہیڈ کلرک بنے، اور آج مسز چوپڑہ ان سے زیادہ کما کر لاتی ہیں۔

تارا۔ (تعجب سے) مسز چوپڑہ کہیں سروس کرتی ہیں؟

رانی ۔ ارے تجھے نہیں معلوم ؟ وہ تو گورنمنٹ کے یہاں سروس کرتی ہیں ۔
ہیں ۔ گورنمنٹ نہیں کیس دے دیتا ہے ۔ وہ دفتروں میں ایک دو گھنٹہ راؤنڈ
لگاکر پرمٹ وغیرہ لے آتی ہیں ۔ بڑا آسان کام ہے ۔ مہینے کے آخر
میں چار سو مل جاتے ہیں ۔

تارا ۔ (انتہائے حیرت سے) مسز چوپڑہ کو چار سو روپے ملتے ہیں ؟ مگر وہ تو
پڑھی لکھی بھی زیادہ ......

رانی ۔ ارے ڈفر ہے ، نری ڈفر ۔ بس ہم لوگوں سے بولنا سیکھ لیا ہے اور ہماری
سوسائٹی میں رہ کر بڑے بڑے افسروں سے جان پہچان کر لی ہے ۔ اسی
لئے ان سے کام کرا لاتی ہے ۔

تارا ۔ مگر یہ بھی کافی مشکل کام ہے ۔

رانی ۔ خاک مشکل ہے ! کیا مشکل ہے ؟ ارے دفتروں میں کام تو سب ہوتے
ہی ہیں ، بس ذرا دیر لگ جاتی ہے ۔ گورنمنٹ کے رشوخ ہیں ۔ بس ان کی مدد
سے مسز چوپڑہ دفتروں میں جاتی ہیں ۔ کام جلدی کرایا اور چلی آئیں ۔ ٹیڑھے
کیس کو گورنمنٹ خود سنبھالتا ہے ۔ یہ کام تو تو اُس سے زیادہ اچھا کر سکتی ہیں ۔

تارا ۔ (حسرت اور رشک سے) ہاں کبھی موقع ملنے کی بات ہے ۔

رانی ۔ موقع کا کیا ہے ۔ تو آج تیار ہو ، کل ہی تجھے سروس دلاتی ہوں ۔ ہمارے
ملک میں پڑھی لکھی عورتیں ہیں کتنی ؟ اور جو ہیں ، وہ بس زچہ خانوں میں
گھسنا جانتی ہیں ۔ دوسرے ملکوں میں دیکھو ۔ ہر گھریلو عورت کہیں نہ کہیں
پارٹ ٹائم نوکری کرتی ہے ۔ صحت بھی بنی رہتی ہے ۔ گھر میں آمدنی بھی
زیادہ ہوتی ہے ۔

تارا ۔ ہاں یہ تو ہے ۔ اگر عورت کچھ نہ کرے تو پیسہ پیسہ کے لئے مرد کی طرف دیکھنا

پڑتا ہے۔

رانی۔ یہی تو کہتی ہوں مگر یش مجھ سے بڑا Impressed ہے۔ تو تیار ہو جا۔ کل اس سے چار سو روپیہ کی سروس دلاتی ہوں۔

(ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے)

رانی۔ ابھی آئی۔ فون سن لوں۔

تارا۔ بس میں بھی اب جاتی ہوں۔ شام ہو گئی ہے۔

رانی۔ اچھا۔ کار لے جا۔ باہر کھڑی ہے۔

تارا۔ اچھا۔

رانی۔ بائی۔ بائی۔

تارا۔ بائی۔ بائی۔

* * * * * * * * * *

ساتواں منظر

(کشور کا کمرہ۔ کشور بنک کی کاپی دیکھتا ہوا اندر آتا ہے)

کشور۔ تارا، بنک کی کتاب میں نو سو روپیہ تھا۔ اب صرف تین سو رہ گیا؟

تارا۔ خرچ جو ہوا ہے۔

کشور۔ یہ چھ سو کہاں خرچ ہوا؟

تارا۔ کیوں، بے بی کے جنم دن کی پارٹی پر خرچ ہوا۔ کچھ کپڑے بنوائے، گھر کی چیزیں لائی اور کچھ باہر آنے جانے ......

کشور۔ تمہیں معلوم ہے، پانچ سو روپے میں نے اپنی بہن کی شادی کے لئے اٹھا کر رکھے تھے۔

تارا۔ لیکن جب گھر میں خرچ ہو گا، تو بنک سے نکالے ہی جائیں گے۔ فالتو تنخواہ.....

کشور۔ (سختی سے) یہ تنخواہ کے آگے "فالتو" کا لفظ مت لگایا کرو۔

تارا۔ کیوں نہ لگاؤں۔ تنخواہ میں گذارہ نہیں ہوتا۔

کشور۔ پہلے کیسے ہوتا تھا؟

تارا۔ میں باورچن اور کہارن کی طرح جو رہتی تھی۔

کشور۔ (مجروح ہو کر) تارا۔

تارا۔ ہاں اسی لئے گذارا ہوتا تھا کہ میں ہر بات میں اپنا من مارتی تھی۔ اپنی خواہشوں کو دباتی تھی۔ اور اس اندھیری کوٹھڑی میں......

کشور۔ آج یہ کمرہ تمہارے لئے اندھیری کوٹھڑی ہو گیا؟

تارا۔ ہاں، لیکن اب مجھ سے اس طرح نہیں رہا جائے گا۔ میں اپنی زندگی یوں اکارت نہ جانے دوں گی۔ میں کچھ کر دوں گی

کشور۔ میں جانتا ہوں، تم کیا کرو گی۔ ہونٹوں پہ سرخی ملکر اور چھ گز کا بلاؤز پہن کر جھینی ساڑھی میں اپنا جسم دکھاتی پھرو گی۔

تارا۔ (سختی سے) کشور۔

کشور۔ اوہ، اب تمہارے گلے کے ———— غدود بھی ضرورت سے زیادہ کام کرنے لگے ہیں؟ تم بہت غلط لوگوں میں جا رہی ہو تارا۔

تارا۔ میں جانتی ہوں۔ لیکن وہ غلط لوگ میری آپ سے زیادہ عزت کرتے ہیں۔ رانی مجھے اپنے برابر بٹھاتی ہے۔ اپنے ساتھ کار میں لے جاتی ہے۔ اس نے مجھے سینکڑوں روپے کے کپڑے تحفہ میں دیئے ہیں۔

کشور۔ وہ تحفے نہیں ہیں۔

تارا۔ تو اور کیا ہیں؟

کشور۔ وہ بخشش ہیں ——— امیر لوگ اپنے نوکروں، شوفروں اور اپنی آیاؤں کو
بھی اس طرح کے تحفے دیتے ہیں تاکہ وہ ان کے ساتھ جانے لائق ہو جائیں۔

تارا۔ تم مجھے رانی کی آیا سے ملاتے ہو؟ تم نے مجھے سمجھا کیا ہے۔ تم سمجھتے ہو
مَیں اُس کے تحفے لے کر بیٹھ جاؤں گی؟ مَیں بھی اُسے تحفے دُوں گی۔ اتنے ہی
قیمتی تحفے۔

کشور۔ کہاں سے؟

تارا۔ (بوکھلا کر) کہاں سے... کہاں سے ——— اوہ .... تم روپے نہ دینے
کی بات کرتے ہو؟ ——— تو سُن لو ——— مجھے تمہارے روپیوں کی پرواہ نہیں۔
مَیں خود کچھ کروں گی ——— نوکری کروں گی ——— کچھ بھی نہ ہوگا تو اپنے
زیور بیچ کر.....

کشور۔ تم زیور بیچو گی؟ پھر یہ تن کے کپڑے بیچو گی؟ پھر یہ گھر بار اور میری عزّت
بیچو گی؟ تمہاری غیرت کو ہُوا کیا ہے؟

تارا۔ (چیخ کر) کشور، خاموش ہو جاؤ۔ ورنہ......

کشور۔ ورنہ کیا (بہت پُرسکون لہجہ میں) تم مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ گی؟ لیکن اب بھی تم یہاں
ہو کہاں؟ تمہارے تن پر دوسروں کے دیئے کپڑے ہیں۔ اور تمہاری آتما بھٹکتی
پھر رہی ہے ——— رانی کے بنگلوں میں، رانی کی کاروں میں، گریش کی پارٹیوں
میں۔

تارا۔ (وحشت زدہ لہجہ میں) تم خاموش ہو گے کہ نہیں؟

کشور۔ خاموش! (گہرا سانس لے کر) تارا تم نے مجھے بولنے کا کہاں رکھا ہے۔
(تیزی سے باہر نکل جاتا ہے۔ کچھ لمحات گذرتے
ہیں۔ پھر گریش داخل ہوتا ہے)

گریش۔ (بڑے ڈرامائی ڈھنگ سے) ہیلو پارٹنر۔

تارا۔ کون (آواز سنوارتی ہوئی) گریش بابو۔

گریش۔ گریش بابو نہیں، پارٹنر کہو۔ آج سے ہم تم حصہ دار ہیں۔

تارا۔ حصہ دار؟ کیسے؟

گریش۔ جیسے میں لوگوں کی آمدنی میں حصہ دار ہوں، ویسے تم میری آمدنی میں حصہ دار ہوگی۔ آج سے ہمارا تمہارا کنٹریکٹ ہوا۔

تارا۔ میں کچھ نہیں سمجھی گریش بابو۔

گریش۔ یہ سب کچھ رانی سمجھائے گی۔ اس وقت تم اس فارم پر دستخط کردو۔

تارا۔ (فارم دیکھ کر) یہ کیا ہے — آپ مجھے پانچسو روپیہ آفر کر رہے ہیں۔ مگر کس کام کے؟

گریش۔ میرا بزنس سنبھالنے کے۔

تارا۔ لیکن مجھے بزنس کا کیا آتا ہے؟

گریش۔ تمہیں (ڈرامائی انداز میں گہرا سانس لیکر) ارے یہ کوئی اس جانور سے پوچھے جو فرانسیسی کہانی کے راجکمار کی طرح جانور کے بھیس میں اس لمحہ کا منتظر ہے، جب کوئی راجکماری اپنے ہونٹوں سے......

تارا۔ (تارا کی ہنسی چھوٹ جاتی ہے) آپ بھی (ہنستے ہوئے) آپ بھی بڑے مزے کے آدمی ہیں۔

گریش۔ تو اسی بات پر دستخط کیجئے۔

تارا۔ نہیں گریش صاحب، کس بات کے دستخط کروں؟ میں جانتی کیا ہوں؟

گریش۔ ہائے ہائے تارا دیوی۔ میں کیسے بتاؤں کہ جب تک اس دنیا میں مرد بستے ہیں، ایک حوا کی حسین بیٹی کو کچھ جاننے کی ضرورت نہیں۔ اس کا بس

مسکراتا، ایک پلک اُٹھا کے ترچھی نظر دیکھنا......

تارا۔ (خوش ہو کر لیکن بظاہر مچلتے ہوئے) دیکھو بھئی گریش پھر ہم ناراض ہو جائیں گے......

گریش۔ ارے نہ نہ نہ، یہ غضب نہ کرنا۔ لو بھئی سنجیدہ ہو گئے۔ اب دستخط کر دو۔

تارا۔ دیکھو گریش، میں سچ کہتی ہوں، بزنس کا مجھے کچھ نہیں آتا۔ اور کشور جی سے پُوچھے بغیر......

گریش۔ یہ میں کب کہتا ہُوں کہ کشور صاحب سے نہ پُوچھو، تمہاری رضامندی حاصل ہو جائے تو میں خود اُن سے......

تارا۔ نہیں نہیں۔ آپ اُن سے اس معاملے میں بات چیت نہ کیجئے گا۔ وہ پسند نہیں کریں گے.....

گریش۔ کیے ؟

تارا۔ نہیں نہیں، یہ کمیشن لینے اور اس طرح پیسے دے کر کام کرانے......

گریش۔ یہ میں جانتا ہوں۔ یہ اندھیرا کمرہ، یہ پُرانا فرنیچر، یہ کھونٹیوں پر خاکی پتلونیں اور سُوتی دھوتیاں سب زبانِ حال سے کہہ رہی ہیں کہ اس گھر کے مالک کو بھی ولی اور پیغمبر بننے کا شوق سمایا ہُوا ہے۔

تارا۔ بھئی تم ہر بات پر مذاق کرتے ہو۔

گریش۔ تارا دیوی مذاق نہ کروں تو مجھے آپ کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرنا پڑے۔ یہ نیکی اور ایمانداری کی بیماری کشور صاحب کو کہاں سے لگی ؟

تارا۔ (سنجیدہ ہو کر) یہ اُن کا اصول ہے۔

گریش۔ زندگی کا صرف ایک اصول ہے تارا دیوی —— جیو اور جینے دو۔ Live and let Live ارے یہ کیا، کہ کشور صاحب نہ خود جیتے

ہیں، نہ دُوسروں کو جینے دیتے ہیں۔ ارے گھاٹ پر بیٹھے ہو تو اپنا کرایہ لو۔ لوگوں کی کشتیوں کو آگے بڑھنے سے کیوں روکتے ہو؟

تارا۔ وہ کہتے ہیں، جب تک ان بُرائیوں کو دُور نہ کیا گیا.......

گریش۔ تو کیا وہ سمجھتے ہیں کہ رشوت نہ لے کر اور پُورا اِنکم ٹیکس لگا کر وہ لوگوں کو بلیک مارکٹ، بے ایمانیاں کرنے، اور غبن کرنے سے روک سکتے ہیں؟ تارا دیوی شروع سے لے کر آج تک دنیا میں ایسا ہی ہوتا آیا ہے دُنیا کا جتیوڑ بدلنے کی کوشش میں انسان کچھ اپنا ہی کھوتا ہے۔

تارا۔ لیکن آتما کی شانتی .....

گریش۔ تو گویا آپ بھی افیون کی اس گولی کو نگل چکی ہیں؟ تارا دیوی اگر آتما وہ چھوئی موئی ہے، جو جھوٹ بولنے، قانون توڑنے، بے ایمانی کرنے سے مرجھا جاتی ہے۔ تو سمجھئے میری رُوح کبھی کی مر چکی۔ لیکن کیا میں مر گیا ہوں؟ کیا میرے چہرہ پر زندگی کی چمک نہیں ہے؟ آپ کے پتی کی آتما زندہ ہے۔ لیکن ان کی زندگی میں کیا ہے؟ وہ دُوسروں کے ساتھ اپنی خوشی اور اپنی زندگی کا گلا گھونٹتے پھرتے ہیں۔ لیکن میں جہاں جاتا ہوں، خوشی کے مسکراہٹ کے زندگی کے دیپ جلاتا ہوں۔ کیا آپ اسکے لئے مجھ سے نفرت کریں گی؟

تارا۔ نہیں نہیں..... میں تو خود کہتی ہوں، مگر وہ نہیں مانتے۔

گریش۔ جانتی ہو، میری تین پشتیں آتما پرماتما کے چکر میں پڑ کر ایمانداری کا تجربہ کرتی رہیں، اور بھوکی مرتی رہیں۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو دیکھا ہمارا سب کچھ اس نیکی کے بھینٹ چڑھ چکا ہے۔ اور دُنیا جُوں کی تُوں ہے۔ بس اپنی آتما کو اپنے پِتا کی استھیوں کے ساتھ گنگا میں بہا کر اس شہر میں چلا آیا۔ اور جب سے اس آتما سے مکتی پائی ہے، ایسا محسوس کرتا ہوں، جیسے گلے کے

بڑھے ہوئے غدود کا آپریشن کرا کے نزلہ، بخار سے ہمیشہ کے لئے نجات پا گیا ہوں۔

تارا۔ میں سمجھتی ہوں، میں سب کچھ سمجھتی ہوں۔ میرے پتا جی نے اتنی بڑی جائداد تنخواہ سے تو نہیں بنوائی لیکن میں کیا کروں، میں مجبور ہوں۔

گریش۔ لیکن میں تو محض آپ کو ایک سروس offer کر رہا ہوں۔ اس میں کشور صاحب کی ایمانداری کو کیا آنچ پہنچتی ہے؟ اگر ان کے ایمان کا خیال نہ ہوتا تو میں آج پانچ ہزار روپے لا کر تمہارے ہاتھ پر نہ رکھ دیتا۔

تارا۔ (حیرت سے) پانچ ہزار؟ کس بات کے؟

گریش۔ ارے ایک ایسی بات کے جس کا کشور صاحب کو گمان بھی نہیں۔ آپ کے کشور صاحب کل میرے ایک client کے بہی کھاتے ضبط کر لائے۔ بہی کھاتوں میں تو خیر انہیں کچھ نہ ملے گا۔ مگر ان کے ساتھ ایک کاپی بھی چلی آئی، جس میں اس کی بلیک کی آمدنی کا حساب ہے۔ اس کاپی کے لوٹانے کے پانچ ہزار مل سکتے ہیں۔

تارا۔ (جیسے یاد کرتے ہوئے) کل بہی کھاتہ ضبط کر کے لائے؟ شام کو؟

گریش۔ ہاں۔

تارا۔ (بظاہر بڑے بے تعلقی کے لہجہ میں) وہ تو اندر رکھے ہوئے ہیں۔

گریش۔ اب بتائیے جس کاپی کا انہیں علم ہی نہیں، اس کے لوٹانے کے پانچ ہزار ملتے ہیں۔

تارا۔ انہیں مل گئی تو وہ ہرگز نہ لوٹائیں گے ——— (ذرا سے توقف سے، عجیب سے لہجہ میں) آپ کے دوست ہیں۔۔۔۔ یا آپ کو کچھ ملتا ہو، تو آپ دیکھ لیجئے ——— اندر رکھے ہیں۔

گریش۔ تارا دیوی ـــــــ دُنیا میں بزنس مَیں میرا کوئی دوست نہیں۔ اور کمیشن لئے بغیر میں کسی سے بات کرتا نہیں۔ آپ اپنے پانچ ہزار لے لیجئے۔ مَیں کاپی دیکھ لیتا ہُوں۔

تارا۔ (الرُک کر) مَیں؟... مَیں....؟

گریش۔ تو رہنے دیجئے۔ ہمارا آپ کا سودا نہیں ہوگا۔

تارا۔ (عجیب سے بالواسطہ لہجہ میں) مَیں پانچ ہزار کا کیا کرونگی؟

گریش۔ کیا کریں گی؟ تارا دیوی ـــــ آپ نے اِس شہر کے خوبصورت فلیٹ دیکھے ہیں؟ چمچماتی کاریں دیکھی ہیں؟ عورتوں کے گلوں میں موتیوں کے ہار اور مردوں کی انگلیوں میں ہیروں کی انگوٹھیاں دیکھی ہیں؟

تارا۔ لیکن اِتنی رقم مَیں کشور سے کیسے چھپا سکتی ہوں؟

گریش۔ کتنی؟ صرف پانچ ہزار کا تو سُچّے موتیوں کا ایک معمولی ہار آتا ہے تارا دیوی، جسے نقلی موتیوں کا بتاکر بڑی آسانی سے ہر وقت پہنا جا سکتا ہے۔

تارا۔ (ایک ساتھ آنکھوں میں چمک آجاتی ہے) آپ بڑے ہی چالاک ہیں۔

گریش۔ (جذباتی ہوکر) تارا دیوی یہ بڑی ظالم دُنیا ہے۔ اِس کے زہر کا مقابلہ زہر ہی سے کیا جا سکتا ہے۔

تارا۔ (جلدی سے) اچھا اچھا۔ مَیں یہاں ہوں۔ آپ اندر جاکر دیکھئے۔ اگر وہ کاپی ان ہی کھاتوں میں ہے۔

گریش۔ بہت بہتر۔ (اندر جاتا ہے۔ اَور کچھ لمحہ بعد کاپی لے کر آتا ہے) مل گئی۔ کاپی مل گئی میری پارٹنر۔

تارا۔ اس کاپی کے لے جانے سے ان کی نوکری کو تو کوئی خطرہ......؟

گریش۔ خطرہ؟ (ہنستے ہوئے) خطرہ اس کاپی کے یہاں رہنے سے تھا، اور اس بات

کا ہے کو بلیک کی آمدنی کا حساب لگاتے لگاتے کشور صاحب کے سر میں درد ہونے لگتا۔ مگر اب تو وہ خطرہ بھی جاتا رہا۔ اچھا آپ کے روپے ؟

(روپے نکالنے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالتا ہے)

تارا۔ اس وقت آپ رکھئے، پھر لے لوں گی۔

گریش۔ کب ؟

تارا۔ کب ؟ رانی اور جینت کی شادی کی سالگرہ پر ——— آپ مجھے دو خوبصورت سی انگوٹھیاں لا دیجئے گا ——— دونوں کے لئے۔

گریش۔ بخوشی ——— لیکن میرا کمیشن ؟

تارا۔ وہ آپ کی شادی کے دن ملے گا۔

گریش۔ بہت خوب، بہت خوب، لیکن وہ کنٹریکٹ ؟

تارا۔ پھر بتاؤں گی۔

گریش۔ اچھا۔ ٹاٹا۔

تارا۔ ٹاٹا ———

* * * * * * * * * * *

ساتواں منظر

(رانی کے یہاں پارٹی کا منظر۔ تارا داخل ہوتی ہے)

تارا۔ رانی

رانی۔ تارا ——— او مائی ڈارلنگ ——— آج کس قدر حسین لگ رہی ہے۔

تارا۔ بس بس۔ بنانے کی کوشش نہ کر۔

رانی۔ میں بنانے کی کوشش کر رہی ہوں ؟ ارے کمبخت آئینہ میں جا کر تو دیکھ۔ یہ

ساڑھی، یہ بلاؤز، اور گلے میں یہ موتیوں کا ہار ـــــ یہ کہاں سے منگوایا
تُو نے ؟

تارا - کیوں ؟ اچھا لگ رہا ہے ؟

رانی - اچھا ؟ IT IS SIMPLY WONDERFULL بالکل LATESS
ڈیزائن کا معلوم ہوتا ہے۔ کہاں سے لیا ؟

تارا - مَیں نے خود نہیں لیا۔ ایک صاحب سے منگایا ہے۔

رانی - کس سے ؟ بتا تو ـــــ مَیں بھی منگاؤں گی۔

تارا - ایسے کام ایک صاحب ہی کر سکتے ہیں ـــــ اپنے کمیشن ایجنٹ۔

رانی - کون - گریش ؟

تارا - ہاں۔

رانی - غضب کی پسند ہے کمبخت کی۔

تارا - یہ تو ہے۔ لیکن ہاں، مَیں آئی تم لوگوں کو شادی کی سالگرہ کی مُبارکباد کہنے
اور تم نے اُلجھا لیا اس جھمیلے میں ـــــ جینت صاحب کہاں ہیں ؟

رانی - پڑے ہوں گے، ڈرائینگ رُوم میں کسی صوفے پر۔ چل دیکھیں۔ لیکن کشور صاحب ؟

تارا - مَیں نے تجھے پہلے ہی بتا دیا کہ ان کا ایک ساتھ ٹُور پروگرام بن گیا ہے۔
اپنے کمشنر کے ساتھ باہر چلے گئے۔

رانی - یہ تو بہت بُرا ہُوا۔

تارا - چل ـــــ مَیں تو ہوں ـــــ اب جینت صاحب کے پاس چلیں۔

رانی - آؤ - ارے لو ـــــ وہ خود آ رہے ہیں۔

(جینت اندر داخل ہوتا ہے)

جینت - ہیلو، ڈارلنگ

رانی - آپ کی اب نیند کھلی ہے اور مہمان آنا شروع ہو گئے۔ دیکھو تارا ہمیں CONGRATULATE کرنے آئی ہے۔

جینت - اوہ شکریہ۔

تارا - اور میری طرف سے آپ دونوں کے لئے یہ تاچیز تحفہ ہے۔ (ڈبہ آگے بڑھاتی ہے۔)

رانی۔ ارے دیکھوں تو، کیا پاگل پن کیا ہے تو نے ——— اوہ کس قدر خوبصورت انگوٹھیاں۔

جینت - AND REAL GEMS اصلی ہیرے۔

رانی - اوہ مائی ڈارلنگ، جینت، دیکھا آج خود جتنی حسین لگ رہی ہے، اُتنے ہی حسین تحفے لائی ہے۔

جینت - یس، مسز کشور YOU ARE LOOKING SIMPLY BEWITCHING -

تارا - اچھا، آپ دونوں نے مجھے بنانا شروع کر دیا ؟

(گریش داخل ہوتا ہے)

گریش - (ڈرامائی انداز میں چلّا کر) رانی ——— ساغر کو میرے ہاتھ سے لینا کر چلائیں۔

تارا - لو، اب تیرے بنانے والے آ گئے۔

گریش - رانی، یہ کیسی بجلیاں کوند رہی ہیں ؟ خدا را - خرمن دل ......

تارا - (ہنستے ہوئے) آتے ہی ڈرامہ شروع کر دیا ——— رانی اندر چلو، کچھ کام کریں گے۔ ان کی باتوں میں اُلجھے تو......

گریش - (بن کر سنجیدہ لہجہ میں) رانی، تم انہیں نہیں لے جا سکتیں۔ آج جب تک تم ان کا اور میرا فیصلہ نہ کرا دوگی، تمہاری پارٹی کا کام نہ ہو سکے گا۔

رانی ۔ (ہنستے ہوئے) کیسا فیصلہ؟
گریش ۔ بزنس کا ـــــ ان کے بنا میرا سارا بزنس چوپٹ ہو جائے گا۔
رانی ۔ ارے ہاں تارا ـــــ تو نے ان کے سٹاف پر آنے سے کیوں انکار کیا؟ گریش پرسوں سے شکایت کر رہا ہے۔
تارا ۔ بھئی، میں نے ان کو وجہ تو بتا دی؟
رانی ۔ میں بھی تو سنوں کہ کیا وجہ ہے تیری؟ تجھے کام نہیں آتا! کشور منع کرتے ہیں! اور کوئی وجہ؟ کام سکھانا گریش کا کام ہے۔ اور کشور صاحب کو میں رضامند کر لوں گی۔ تجھے کیا پریشانی ہو گریش آج پارٹی کے بعد تمہارا کنٹریکٹ منظور کرا دیا جائے گا ـــــ اب ہمیں اندر جانے دو
گریش ۔ شکریہ رانی ـــــ تم جاؤ لیکن کیا انہیں بھی.....
رانی ۔ اور کیا تمہارے پاس چھوڑ جاؤں گی، منہ دھو کر آؤ۔
گریش ۔ کہاں اندر؟
رانی ۔ (ہنستے ہوئے) ہاں وہاں مسز چوپڑہ تمہارے انتظار میں چائے کے پیالے گن رہے ہیں۔
گریش ۔ تو ابھی چلا ـــــ ایسا نہ ہو کہ اس کے بل مجھے ادا کرنے پڑیں۔ (اندر جاتا ہے)۔
تارا ۔ رانی، یہ تو لے کیا کرا دیا؟
رانی ۔ کیوں ہے تجھے پانچ سو برے لگتے ہیں؟ اور تم لوگوں کی آمدنی اتنی کم ہے کہ تمہیں کچھ کرنا چاہیئے۔ کم از کم ایک عمدہ سا فلیٹ ہو، کار ہو، نوکر اور آیا ہو ـــــ اب کیا زندگی گزارتی ہو؟ بس چولہا، چکی اور جھاڑو۔ دیکھ ذرا اس چکر سے نکلی ہے، تو کیا رونق آئی ہے چہرے پر کتنی INTELLIGENT ہے کہ خود جدت تعریف کر رہے تھے ـــــ اگر تو کچھ کام نہ کرے گی، تو کیا

گاؤں کی لڑکیاں آگے آئیں گی؟

تارا۔ لیکن کشور۔

رانی۔ وہ کیوں نہیں مانیں گے؟ یہ مردوں کی عجیب ذہنیت ہے کہ عورتوں کو سوائے اپنی غلامی کے اور کچھ نہ کرنے دیں گے۔ خود زندگی کا لطف لیں گے اور ساری غریبی، تنگی اور گھٹن عورت کیلئے چھوڑ دینگے۔ آخر اس گھٹن سے باہر نکلنے کا حق ہمیں بھی تو ہے۔

تارا۔ یہ تو ٹھیک ہے لیکن گرلش کے یہاں نوکری کرنے پہ تو خاص کر.....

رانی۔ گرلش کے یہاں نوکری پہ کیا اعتراض؟ ارے تمہیں پانچسو روپیہ مہینہ دے کر وہ تم پہ یا کشور پہ احسان نہیں کرے گا —— سال میں ایک کیس بھی اس کا ٹھیک کرا دیا، تو وہ تیس پینتیس ہزار کمیشن کھا جائے گا۔ گھاٹے کے سودے میں گرلش کبھی ہاتھ نہیں ڈالتا۔

تارا۔ یہ تو ہے، پورا بزنس مین ہے۔

رانی۔ لیکن تب بھی کمیشن لینے اور دینے میں پورا ایماندار ہے —— یہ میری چھوٹی فرانسیسی کار ہے نا —— اس نے کمیشن میں دلوائی تھی۔

تارا۔ تجھے؟

رانی۔ ہاں —— میں نے اس کا ایک کام کر کے دیا تھا —— اگلے ہی دن یہ کمیشن دے گیا۔ تو اس کے ٹھاٹ پہ تو جا کر دیکھ —— کیا مزے کی زندگی ہوگی —— روز پارٹی، روز سیر و تفریح اور پھر شہر کے بڑے بڑے افسروں سے ملاقات —— میری تارا چمک اٹھے گی۔

تارا۔ تیری بدولت۔

رانی۔ دھت —— ایسی SILLY باتیں کرے گی، تو سر توڑ دوں گی —— اب

سیدھی سیدھی چل اور اندر کا کام دیکھ۔

(دونوں اندر جاتی ہیں)

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

آٹھواں منظر

(کشور کا کمرہ۔ کمرہ کی جیسے کایا پلٹ گئی ہے۔ ہر چیز نئی ہے۔)

تارا۔ آپ ٹور سے آ گئے؟

کشور۔ ہاں — مگر یہ کیا؟

تارا۔ کیا؟

کشور۔ یہ نیا صوفہ، یہ نیا فرنیچر، یہ نئے پلنگ پوش — یہ سب کچھ کیا ہے؟

تارا۔ اچھا لگتا ہے نا اب ہمارا یہ کمرہ — اور یہ دیکھو۔

(الماری کھولتی ہے)

کشور۔ یہ الماری اور یہ سوٹ کیسے؟ (سختی سے) یہ سب کچھ کہاں سے آیا تارا؟

تارا۔ بتا دوں گی، بتا دوں گی — ذرا آرام تو کرو — جیون — صاحب کے لئے شربت لاؤ۔

کشور۔ یہ جیون کون ہے؟

تارا۔ ہمارا نوکر۔

کشور۔ تارا — یہ سب کچھ کیا ہے؟ یہ . . . یہ، ان کے لئے روپے کہاں سے آئے؟

تارا۔ دو گھڑی سانس تو لو — باہر سے آئے ہو — لائیے تمہارے جوتے کھولوں۔

کشور۔ نہیں تارا — پہلے یہ بتاؤ — یہ کس نے دیئے؟

تارا۔ کسی نے نہیں ——تمہاری تارا لائی ہے۔
کشور۔ کہاں سے ؟
تارا۔ بازار سے۔
کشور۔ یہ میں بھی جانتا ہوں — لیکن ان کے لئے روپیہ کس نے دیئے ؟
تارا۔ میں نے خود کمائے ہیں —— میں نے سروس کر لی ہے۔ بات یہ ہے کشور کہ میں تمہارے پیچھے یہ فیصلہ نہ کرتی۔ لیکن رانی نے .....
کشور۔ تو اب تم رانی کی نوکرانی ہو ؟
تارا۔ نہیں۔ میں اب گرلیش کے سٹاف پر ہوں۔
کشور۔ (پوری سختی سے) تارا۔
تارا۔ ناراض نہ ہو کشور پہلے پوری بات سُن لو۔
کشور۔ اوہ ، تمہاری اتنی جرأت ہو گئی ؟
تارا۔ میں بتا تو رہی ہو......
کشور۔ تو بتاؤ، کہ اپنے کو کیسے اور کتنے میں تم نے گرلیش کے ہاتھوں بیچا ؟
تارا۔ (ذرا تیزی سے) کشور۔
کشور۔ بتاؤ، تم نے اپنی کیا قیمت لی ؟
تارا۔ اس طرح باتیں نہ کرو کشور —— میں نے جو کچھ کیا ہے۔ سوچ سمجھ کر کیا ہے۔
کشور۔ وہ میں جانتا ہوں۔ پہلے بتاؤ کیا دیا اُس نے ؟
تارا۔ وہ مجھے پانچ سو روپے مہینہ دے گا۔
کشور۔ اور کاپی کا کیا دیا اُس نے ؟
تارا۔ (گھبرا کر) کیا ؟ کیسی کاپی ؟
کشور۔ وہ جو ایک فرم کے بہی کھاتوں کے ساتھ میں ضبط کر کے لایا تھا۔ اور یکایک میز

سے گم ہو گئی تھی

تارا ۔ مجھے کسی کاپی کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔

کشور ۔ سچ کہتی ہو؟

تارا ۔ آں ..... ہاں .....!

کشور ۔ اور اس رومال کے بارے میں بھی نہیں جانتی ؟ (جیب سے ایک رومال نکالتا ہے)

تارا ۔ یہ کس کا ہے ؟

کشور ۔ گریش کا ـــــ اس کے کونے پہ اس کا نام لکھا ہے۔

تارا ۔ مگر اس کا مجھ سے کیا تعلق ؟ تم کیا کہنا چاہتے ہو ؟

کشور ۔ صرف یہ، کہ جس دن وہ کاپی غائب ہوئی، یہ رومال میز پر رکھا ملا۔ میں نے سوچا شاید گریش چرا کر لے گیا۔ لیکن جب میں نے تم سے پوچھا کہ گریش تو نہیں آیا، تم نے صاف انکار کر دیا لیکن تمہاری کپکپاتی آواز نے، لرزتے جسم نے اور سفید چہرے نے مجھے بہت کچھ بتا دیا۔ اس دن سے آج تک میں خاموش تھا، مجھے کوئی اور ثبوت مل جائے لیکن آج ثبوت کی کمی نہیں ہے۔ اس کمرے کی ایک ایک چیز، تمہارے تن کا اک اک کپڑا شاہد ہے کہ تم نے وہ کاپی گریش کو بیچی تھی ـــــ اس کا کیا لیا ؟

تارا ۔ میں نے کچھ نہیں لیا۔ مجھے کچھ نہیں معلوم۔

کشور ۔ تم بے بی کو چھو کر یہ بات .....

تارا ۔ (چونک کر) کشور ۔ نہیں نہیں، یہ نہ کہو (گہرا سانس لے کر) کشور میں نے اس کاپی کے پانچ ہزار لیے۔ لیکن مجھے خیال نہ تھا، تم وہ کاپی دیکھ چکے ہو۔

کشور ۔ اوہ، تو یہ سب کچھ صحیح نکلا ـــــ میری بیوی نے میرے گھر میں میرے یقین،

میرے ایمان کو بیچ دیا۔

تارا۔ کشور ـــــ اب جب تم کو سب کچھ معلوم ہو گیا ہے تو میں کچھ نہیں چھپاؤں گی۔ میں نے تمہارے ساتھ دغا یا دھوکہ نہیں کیا۔ صرف اُس گھٹن، اس تنگی اور اس تاریکی سے نکلنے کی کوشش کی ہے۔ جو میرا دم گھونٹ رہی تھی، تمہارے لئے میری محبت کو دھیرے دھیرے ختم کر رہی تھی۔ کشور، ایک لمحہ کے لئے سوچو، ہماری تمہاری زندگیوں میں کیا ہے؟ تم روز دفتر جاتے ہو اور رات گئے تھکے ماندے آتے ہو۔ میں دن بھر روٹی اور جھاڑو کے چکر میں اُلجھی رہتی ہوں ـــــ دن، ہفتہ، مہینہ اور سال گزر جاتے ہیں۔ مگر زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آتی، رنگینی نہیں آتی ـــــ بس وہی گھٹن، وہی تنگی ـــــ میں اب اس زندگی کو بدلنا چاہتی ہوں۔

کشور۔ اور اس کے لئے تم نے اُنہیں لوگوں سے سمجھوتہ کر لیا، جو تمہاری زندگی کی اس گھٹن، تنگی اور تاریکی کے لئے ذمہ دار ہیں؟ میں جی توڑ محنت کرتا ہوں۔ اپنی تنخواہ کے ڈھائی سو روپیہ سے تمہیں آرام اور آسودگی کی زندگی دے سکتا ہوں۔ پر میں کیا کروں؟ تمہارے جینت جیسے دوست آتے ہیں اور کپڑا مہنگا کر کے، اناج مہنگا کر کے، مکان مہنگے کر کے میری ساری دولت لوٹ لے جاتے ہیں۔ قانون اُنہیں پکڑنے کی کوشش کرتا ہے، تو گرلیش اور چوپڑہ جیسے لوگ قانون کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیتے ہیں۔ اب میں کیا کر سکتا ہوں؟ اس گھٹن اور تنگی کو دور کرنے میں تم میرا ہاتھ بٹا سکتی تھیں۔ محنت کر کے، ان کے خلاف لڑ کے، لیکن تم تو خود ان کی صف میں پہنچ چکی ہو۔ تم نے میرے اور اپنے دشمنوں کے ہاتھ مضبوط کئے ہیں۔

تارا۔ لیکن میں جانتی ہوں، میں اُن لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ لوگ ہمیشہ سے

ایسا کرتے آئے ہیں۔ ہم دے نو نہیں سُدھار سکتے۔ طوفان میں دو تنکوں سے ہم اپنا گھونسلا نہیں بنا سکتے۔ شاید کچھ لوگ ایسا کر سکتے ہیں۔ برسوں انتظار کر کے۔ لیکن مَیں انتظار نہیں کر سکتی۔ تکلیف نہیں سہہ سکتی۔ مجھے خوشی چاہیئے اور اسی وقت چاہیئے ـــــ اور اس لئے جیسے ہی مجھے موقع مِلا، مَیں نے خوشی کو پکڑ لیا۔ اور اب مَیں بہت خوش ہوں، مَیں مسکرا سکتی ہوں، دِل کھول کر قہقہہ لگا سکتی ہوں، تم سے پُوری شدت کے ساتھ محبت کر سکتی ہوں۔

کشور۔ اب تم مجھ سے کبھی محبت نہیں کر سکتیں۔ اب تم صرف اس کشور کو چاہ سکتی ہو جس کے کاندھوں پر جنیت کا کوٹ ہو، سر پر گرلیش کا ہیٹ ہو۔ مُنہ میں چوڑا کا سگریٹ ہو، اور شخصیت میں اُن لوگوں کا پرتو ہو، جنہیں تم نے کاروں سے اُترتے ہوئے اور ہوٹلوں کی سیڑھیوں پر چڑھتے دیکھا ہے۔ لیکن مَیں وہ کشور نہیں ہُوں۔ مَیں کبھی وہ کشور نہیں بنوں گا۔

تارا۔ لیکن اب تمہیں وہ کشور بننے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ مَیں تمہیں کسی بات کے لئے مجبور نہیں کروں گی۔ تم جیسے چاہو رہ سکتے ہو۔ گھر کی ضرورتیں پُوری کرنے میں اب مَیں ہاتھ بٹاؤں گی۔

کشور۔ گرلیش کے یہاں نوکری کر کے؟ واقعی تم اب مجھے مجبور نہ کرو گی، کیونکہ تم اپنے کو بیچکر پانچ سو روپیہ مہینہ لاؤ گی؟

تارا۔ کشور دیکھو، ایسے نہ کہو، جھگڑا نہ بڑھاؤ۔ مَیں نے اپنے کو نہیں بیچا۔ صرف اپنا وقت بیچا ہے۔ مَیں صرف کام کروں گی؟

کشور۔ کیا کام کرو گی؟ مجھے بتاؤ، تم کیا کام کر سکتی ہو؟ تمہیں بزنس نہیں آتا۔ تمہیں اکاؤنٹ رکھنا نہیں آتا۔ تم ٹائپ تک نہیں کر سکتیں۔ پھر کس بات کے پانچ سو روپے؟ یہ سب تمہاری خوبصورتی......

تارا۔ (تیزی سے) کشور

کشور ۔ ہاں، یہ سب تمہاری خوبصورتی کی قیمت ہے، جسے گریش ان افسروں کو رشوت کے طور پر پیش کرائے گا، جن سے تم پرمٹ لینے اور خلاف قانون کام کرانے جاؤگی۔ گریش پیسے کی رشوت دے گا۔ تم اپنی مسکراہٹوں اور نگاہوں کی رشوت دوگی۔ اور اس طرح تم دونوں لوگوں کے ایمان اور اصول خریدتے پھروگے۔

تارا۔ کشور، میں تمہیں یقین دلاتی ہوں، میں ایسا کوئی کام نہیں کروں گی جس سے تمہاری عزت یا میرے من میں تمہاری محبت ......

کشور۔ ان لفظوں کو استعمال نہ کرو کیونکہ ان دونوں کو تم گریش کے یہاں گروی رکھ چکی ہو۔ (گہرا سانس لے کر) آخر تم میری بیوی سے زیادہ اپنے باپ کی بیٹی ثابت ہوئیں۔ ایک رشوت خور باپ کی رشوت خور بیٹی ......

تارا۔ (چلاّ کر) گریش میرے پتاجی کو......

کشور۔ تمہارے پتاجی رشوت خور تھے —— اور کاش مجھے معلوم ہوتا، تمہارے اندر بھی وہی جراثیم موجود ہیں......

تارا۔ اور کاش مجھے بھی معلوم ہوتا، تمہارے ساتھ میری زندگی یوں تباہ ہو جائیگی۔

کشور۔ تم اپنی اس زندگی کو میرے پاس سے لے جا سکتی ہو۔

تارا۔ تم مجھے چھوڑنے کی دھمکی دے رہے ہو؟

کشور۔ دھمکی اُسے دی جاتی ہے، جو کمزور ہوتا ہے۔ آج تم کمزور نہیں ہو ... اپنے قدموں پہ اور زیادہ بلندی پر کھڑی ہو۔

تارا۔ تم ...... تم مجھے گھر سے نکال دوگے؟

کشور۔ گھر سے؟ لیکن یہ میرا گھر کہاں ہے —— تم میری کہاں ہو؟ اس گھر کا فرنیچر

اس کے پردے، اس کی تصویریں میری نہیں۔ تمہارے کانوں کے آویزے، گلے کا ہار، جسم کا بلاؤز اور ساڑھی بھی میری نہیں ہیں۔ یہ کسی اور کی دی ہوئی ہیں۔ میں اس گھر میں اجنبی ہوں۔ یہ گھر اب میرا نہیں ہے۔

تارا۔ (خوفزدہ ہوکر) کیا.... کیا۔ تم گھر چھوڑ کر چلے جاؤ گے؟

کشور۔ ہاں، میں چلا جاؤں گا، میں تبادلہ کرا کے اس شہر سے چلا جاؤں گا۔ وہاں جہاں میری زندگی پر تمہارا سایہ نہ پڑ سکے —— اور بے بی میرے ساتھ ہوگی۔

تارا۔ (تڑپ کر) یہ کیا کہہ رہے ہو! میں بے بی کو کبھی نہ جانے دوں گی۔ کہیں نہ جانے دوں گی۔

کشور۔ (سختی سے) میں اُسے لے جاؤں گا اور ضرور لے جاؤں گا۔ تم اب اُس کی ماں بننے کے لائق نہیں ہو۔ اور میں نہیں چاہتا، کہ بڑی ہو کر وہ بھی تمہاری طرح اپنے پتی کی آتما میں اور سماج کے جسم میں زہر بھرنا سیکھ جائے۔

تارا۔ نہیں، یہ کبھی نہیں ہو سکے گا۔ میں بے بی کو کبھی نہیں دوں گی۔

کشور۔ میں اُسے قانوناً تم سے لے لوں گا۔

تارا۔ (چیخ کر اور خوفزدہ لہجہ میں) تم..... تم یہاں تک سوچ چکے ہو؟ تم مجھے کورٹ میں لے جاؤ گے؟ مجھ پر الزام لگاؤ گے؟

کشور۔ ہاں، اگر ضرورت ہوئی، تو میں الزام بھی لگاؤں گا۔ لیکن وہ جھوٹا الزام نہیں ہوگا۔

تارا۔ تم اس قدر ظالم بن گئے ہو؟

کشور۔ ہاں۔ اب میں ظالم بن گیا ہوں۔ ہر آدمی کا ایک خیال ہوتا ہے۔ وہ اُس خیال میں جیتا ہے، اُسی سے محبت کرتا ہے۔ لیکن خیال اچھا بھی ہوتا ہے

اور بُرا بھی۔ خوبصورت بھی ہوتا ہے اور بدصورت بھی۔ اس لئے خیال ایک دُوسرے کے دوست بھی ہوتے ہیں اور دشمن بھی۔

تارا۔ اور تمہارا خیال میرے خیال کا دُشمن ہے ؟

کشور۔ ہاں، اب ہمارے راستے مختلف سمتوں میں جاتے ہیں ہم اب مخالف گروہوں میں کھڑے ہیں۔ میری خوشی اب تمہاری خوشی نہیں ہے، میرا اصول اب تمہارا اصُول نہیں ہے۔ تم خود بارہا کہہ چکی ہو۔ کہ تم سے ایسے نہیں رہا جاتا۔ تمہارا رنگ رُوپ، تمہاری ہنسی خوشی، سب کچھ میرے اصُولوں کی بھینٹ چڑھ چکی ہے۔

تارا۔ لیکن اس کے باوجود میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ میں تم سے پہلے جتنی محبت کرتی ہوں۔

کشور۔ یہ غلط ہے تارا —— محبت تو چراغ کی ایک جھلملاتی لَو ہے —— ایک پیلی کمزور سی لو۔ لیکن اس لو کی زندگی اور روشنی بھی "خیال" کے دم سے ہے۔ جب دو ہاتھ مل کر خیال کی چمنی کو اس لو پر رکھ دیتے ہیں، تو یہ دمک اُٹھتی ہے۔ لیکن جب وہ ہاتھ اس چمنی کو اُتار کر پھینک دیتے ہیں، تو یہ پھر بےوہ ہو جاتی ہے —— تارا ہماری تمہاری محبت کا سُہاگ اُجڑ چکا ہے۔

تارا۔ (چلاتی ہے) کشور۔

(کشور تیزی سے باہر نکل جاتا ہے۔ تارا کٹے ہوئے درخت کی طرح صوفے پر گر کر سسکتی رہ جاتی ہے۔ روشنیاں گل ہو جاتی ہیں۔)
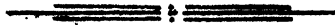
پہلا منظر

(ایک خوبصورت بنگلہ کا ڈرائینگ روم، جس میں ہرے رنگ کی روشنی ہو رہی ہے۔ صوفہ پر تارا اور نریش بیٹھے ہیں۔ تارا کی عمر تقریباً ۲۶-۲۷ سال ہے اور نریش کی تقریباً ۳۵-۳۶ سال۔ تارا نرسنگ کی تعلیم پا رہی ہے اور نریش مقامی کالج میں پروفیسر ہو کر آیا ہے۔ بنگلہ تارا کی سہیلی بملا کا ہے جو لیڈی ڈاکٹر ہے اور جس کے پاس تارا پچھلے دو سال سے رہ رہی ہے۔ دیوار پر لگی گھڑی ٹن سے ساڑھے دس بجاتی ہے۔)

تارا۔ اوہ، رات کے ساڑھے دس بج گئے۔

(اسی وقت بادل گرجتے ہیں)

تارا۔ بادل گرج رہے ہیں۔ بارش آنے والی ہے۔

(نریش کوئی جواب نہیں دیتا۔ صرف تارا کی طرف بڑی اداس نگاہوں سے دیکھے جاتا ہے۔)

تارا۔ آپ کے پاس تو چھاتا یا برساتی بھی نہیں ہے۔

نریش۔ (مجروح ہوکر) تارا۔

تارا۔ ابھی بارش آنے میں کچھ دیر ہے، اگر آپ ابھی چلے جائیں۔

نریش۔ تارا۔ تم اس قدر سنگ دل ہوگئی ہو۔ تم اپنے مُنہ سے مجھے جانے کو کہہ رہی ہو؟

تارا۔ جانا ہی ہوگا نریش۔ یہ میری سہیلی کا بنگلہ ہے۔

نریش۔ یہ مجھے معلوم ہے، اور میں یہاں رات بسر کرنے نہیں آیا ہوں۔ لیکن مجھے اتنا بتادو۔ کیا تمہارے دل میں میرے لئے قطعی نرمی نہیں رہی؟

تارا۔ نرمی! نریش، نرمی، محبت، خوشی، اُمنگ، میرے لئے سب کچھ مرگیا ہے۔

نریش۔ یہ غلط ہے تارا۔ یہ ہمارے ملک کی دَم گھُوٹنے والی سماجی فضا کا اثر ہے، ورنہ بیوہ ہونے پر ایک عورت کا سب کچھ نہیں مرجاتا۔

تارا۔ نریش، مَیں بیوہ ہی نہیں ہوں۔ میری دوسری شادی بھی ہُوئی تھی۔

نریش۔ (چونک کر) دوسری شادی، بیوہ ہونے کے بعد؟

تارا۔ ہاں، اور مَیں نے طلاق بھی لیا ہے۔

نریش۔ (اور چونک کر) طلاق؟

تارا۔ ہاں، اور میرے ایک لڑکا بھی ہے۔ پانچ سال کا۔

نریش۔ (چونک کر کھڑا ہو جاتا ہے) تم کیا کہہ رہی ہو؟

تارا۔ وہ جو بالکل سچ ہے اور جو تم بالکل نہیں جانتے، اور شاید اسی لئے مجھے
اس شہر میں دوبارہ دیکھتے ہی تم بے چین ہو اٹھے، اس کہانی کو پورا کرنے
کے لئے جو ادھوری رہ گئی تھی۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ اگر میں تمہیں وہ سب کچھ
بتا دوں جو مجھ پر بیتی ہے، تو تم یہاں ایک منٹ نہ ٹھہرو گے، تم چلے جاؤ گے۔

نریش۔ (اپنے کو سنبھال کر) تارا تم جو کچھ کہنا چاہتی ہو، کہہ دو۔ میں مرد ہوں۔ مرد کی کمزوریوں
کو، اس کے جذباتی اتھلے پن کو جانتا ہوں لیکن اگر یہ جان لینے کے بعد
بھی کہ تم بیوہ ہو چکی ہو، میرے دل میں تم سے شادی کرنے کی تمنا پیدا ہوئی،
تو میں وہ سب کچھ برداشت کر لوں گا۔

تارا۔ برداشت نہ کر سکو گے نریش، کیونکہ تم ابھی اپنے کو نہیں جانتے۔ کہنا بہت آسان
ہوتا ہے، لیکن برداشت کرنے کے لئے بہت بڑا دل چاہیئے، اور وہ مرد کے
پاس نہیں ہوتا۔

نریش۔ تارا، دل چھوٹا بڑا نہیں ہوتا۔ دماغ چھوٹا بڑا ہوتا ہے۔ برداشت کرنے
کے لئے، سمجھنے کے لئے، دل کی نہیں، دماغ کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں یہ تو
نہیں کہتا کہ میرے پاس بڑا دماغ ہے لیکن ہر قسم کی تنگ نظری سے بچنے کی
کوشش میں نے ضرور کی ہے۔ تمہارے لئے میری محبت بھی شاید اسی کوشش
کا ایک نتیجہ ہے۔

تارا۔ ہو سکتا ہے نریش تم نے سچ کہا ہو۔ لیکن میری زندگی میں اب شادی کی کوئی جگہ
نہیں ہے۔ تم میرا خیال چھوڑ دو۔

نریش۔ خیال ہی تو نہیں چھوڑا جاتا تارا۔ اگر یہ خیال دامن سے، گرد کی طرح جھاڑا جا
سکتا، تو ایک بار انکار سننے کے بعد، آج پھر اتنے برس بعد میں دوسرا

انکار سُننے نہ آتا۔ خود داری کی مجھ میں کچھ کمی نہیں ہے۔

تارا۔ (متاثر ہوکر) نریش؟

نریش۔ ہاں تارا۔۔۔۔ جس دن تم نے پہلی بار انکار کیا تھا، اُسی دن میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ مَیں تم سے نہیں ملوں گا۔ مَیں اس سوال کو کسی عورت کے سامنے نہیں دُہراؤں گا۔ اس لئے مَیں وہاں سے نوکری چھوڑ کر چلا آیا۔ مَیں نے سُنا کہ تم بیوہ ہوگئی ہو۔ تمہیں دیکھنے کو، تمہارے آنسو پُونچھنے کو میرا دِل بیتاب ہوا اُٹھا۔ کئی راتیں مَیں نے اُس اضطراب میں کاٹیں، جو سمندر کی طرح دِل کی کشتی کو تہہ و بالا کرڈالتا ہے۔ لیکن مَیں نے ضبط کا سہارا لیا۔ خود داری کے مستول سے لپٹ کر مَیں نے طوفان کے وہ لمحات کاٹ ڈالے۔ لیکن جس دِن مَیں نے تمہیں اچانک یہاں دیکھا، میرے سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ دل کے ہاتھوں میں پھر مات کھا گیا۔

تارا۔ مَیں جانتی ہوں۔ تمہیں مجھ سے بے حد محبت تھی۔ جیسے تم نے مجھے چاہا، شائد ویسے مَیں نے تمہیں نہیں چاہا۔ آج بھی اگر تم کنوارے ہو، اِس لمحہ یُوں اُداس اور غمگین میرے سامنے ہو، تم صرف اس لئے کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔ (جذباتی ہوکر) لیکن مَیں تمہاری محبت کے لائق نہیں ہُوں نریش۔ اب مَیں ہرگز تمہیں کوئی خوشی نہیں دے سکتی۔

نریش۔ لیکن مجھے تم سے کچھ نہیں چاہیئے۔ تمہیں پاکر مجھے سب کچھ مل جائے گا۔

تارا۔ نہیں نریش، تم نے تجربہ نہیں کیا ہے۔ مَیں نے تجربہ کرکے دیکھ لیا ہے۔ اب مَیں کسی کی نہیں ہوسکتی، کیونکہ میرے ساتھ دو آدمیوں کے بھوت ہیں۔ میرے دو شوہروں کے۔

نریش۔ تم کیا کہہ رہی ہو تارا! دُنیا میں بھوت کا کوئی وجود نہیں۔ مَیں کسی طرح کے

بھگوت میں یقین نہیں کرتا۔

تارا۔ لیکن کرنے لگوگے نریش، مَیں نے دیکھ لیا ہے۔

نریش۔ تم نے کیا دیکھا ہے؟

تارا۔ مَیں نے دیکھا ہے کہ مردوں کی اِس دُنیا میں عورت ایک بے زبان گائے ہے، پتھر کی ایک سِل ہے، مٹی کا کچا برتن ہے، جسے ایک بار اُتر جانے کے بعد کوئی نہیں اپناتا۔

نریش۔ مَیں کچھ نہیں سمجھتا، تم کیا کہہ رہی ہو، کس جذبہ کے ماتحت کہہ رہی ہو۔

تارا۔ تم سب کچھ سمجھ جاؤ گے نریش۔ میری ننھی سی زندگی کی داستان تمہیں سب کچھ سمجھا دے گی۔ اور مَیں اِس داستان کا ایک لفظ بھی نہیں چھپاؤں گی، کیونکہ اِسی میں تمہارے اُس سوال کا جواب موجود ہے، جو تم نے دوسری بار مجھ سے کیا ہے۔ یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ مَیں ایک بہت معمولی گھرانے کی لڑکی ہوں۔ میرے ماں باپ نے مجھے پڑھا تو دیا، لیکن میری شادی کرنے کے لیئے ان کے پاس پھوٹی کوڑی نہ تھی ——اِس لیئے دِن رات وہ اسی چِنتا میں پڑے رہتے تھے۔

(اسٹیج پر تاریکی چھا جائے اور پھر آرک لیمپ سے اسٹیج کے درمیان محدود جگہ پر روشنی ڈالی جائے۔ اس کی روشنی کے حلقہ میں تارا کے ماں باپ بیٹھے نظر آئیں۔ بعد کے تمام مناظر یعنی FLASH BACK کے سین اس تکنیک سے پیش کئے جا سکتے ہیں۔ ریڈیو پر موسیقی کے ہلکے ٹکڑے سے سامعین کو ماضی میں لے جایا جا سکتا ہے۔)

باپ۔ کیا کروں؟ ناؤ کیسے پار لے جاؤں؟ جس گھاٹ جاتا ہوں، مگر مچھ مُنہ پھاڑے بیٹھے ہیں۔ کوئی آٹھ ہزار مانگتا ہے، کوئی دس ہزار۔

ماں۔ پر کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔ لڑکی کو سولھواں جا رہا ہے۔

باپ ۔ ہاں، پر کرنا کیا ہوگا، بیٹی کو کسی کنوئیں میں دھکا دینا ہوگا۔

ماں ۔ یہ کیسی بات منہ سے نکال رہے ہو؟

باپ ۔ جو دکھائی پڑ رہا ہے، وہی کہہ رہا ہوں۔ مَیں تو چار بیٹوں اور ایک بیٹی کے بیاہ کر کے ختم ہو گیا۔ میرے پاس اب سنکھیا کھانے کو بھی کچھ نہیں بچا۔ لڑکا ہے، سو ڈیڑھ سو روپلی لاتا ہے، اور اس کے اپنے بچے ہو گئے ہیں۔ ہمیں ہی جانے کیسے روٹی دے رہا ہے۔ جہیز کا بندوبست کون کریگا؟

ماں ۔ پر بیٹی کے ہاتھ تو پیلے کرنے ہی ہوں گے۔

باپ ۔ ہاتھ پیلے کیا کروں گا (گہرا سانس لیکر) مجھے تو ایسے لگتا ہے، اس کے ارمانوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگوں گا۔

ماں ۔ ہائے، ایسے نہ کہو۔ یہ بیٹی تو سب سے سُندر ہے، سب سے گُن وان ہے۔

باپ ۔ پر بھاگیہ کی سب سے ہیٹی ہے، تارا کی ماں۔ اِسے دیکھتا ہوں، اور جو کچھ اس کے ساتھ ہونے والا ہے، اِسے سوچتا ہوں، تو آتما کانپ اُٹھتی ہے۔ لگتا ہے، برہمن ہو کر گائے کو قصائی کے ہاتھ دینے کی سوچ رہا ہوں۔ اس کے ساتھ جو ظلم کروں گا، اس کا پراشچت سات جنم نہیں کر پاؤں گا۔

ماں ۔ تو کیا اُسی تہیجیاں والے سے شادی کر دوگے؟ اُس کی تو عمر بہت پک گئی ہے۔ اور اُسے دل کی بیماری ۔ ۔ ۔ ۔

باپ ۔ اس میں ایک نہیں ہزار بیماریاں ہیں۔ پر ایک صفت ہے، تارا کی ماں —— وہ جہیز کے دَمڑی ہزار نہیں مانگتا ہے۔ تجھے یہ خوبی پسند ہو، تو داماد بنا لے۔

ماں ۔ اور کوئی راستہ نہیں ہو سکتا؟

باپ ۔ مجھے تو نہیں سُوجھتا۔ تجھے سُوجھتا ہو تو بتا دے۔

(آرک لیمپ کی روشنی بجھ جائے۔ دوبارہ
روشنی ہو تو تارا اور نرلیش بیٹھے نظر آئیں)

تارا۔ ماں اور پتا جی کو راستہ نہ سوجھتا تھا، لیکن مجھے ایک راستہ سوجھ رہا تھا۔ تم ایک
روشن اور خوبصورت منزل کی طرح میرے زندگی کے اس چھور سے اُس چھور تک
چھا گئے تھے۔ تمہاری محبت نے آس کا ایک دیا میری اندھیری دنیا میں جگا دیا
مَیں نے ماں کو بھی اِس دیئے کی روشنی میں راستہ دکھانا چاہا۔

نرلیش۔ (چونک کر) تم نے اپنی ماں سے میرے بارے میں ذکر کیا تھا؟

تارا۔ ہاں۔ ایک دوپہر کو جب گھر میں کوئی نہ تھا۔ بس مَیں تھی اور ماں تھی یا پھر سناٹا
تھا، مَیں نے ہمت کر کے زبان کھولی۔

(فلیش بیک کو بتائی ہوئی تکنیک سے پیش کیا جائے)

تارا۔ ما......ماں، ماں کیا سو گئیں؟

ماں۔ (کروٹ بدل کر اُٹھتی ہے) اری سونا میرے بھاگ میں کہاں لکھا ہے۔
جب تک تو نہ بیاہی جائے گی، مَیں کہاں سو سکوں گی۔

تارا۔ تم اتنی فکر کیوں کرتی ہو ماں؟

ماں۔ ہاں، فکر کرنے سے ہوگا بھی کیا۔ ہوگا تو وہی جو بھاگیہ میں لکھا ہے۔

تارا۔ (معنی خیز انداز میں) پر ماں، جو بھاگیہ کو بدلنا چاہو، تو بھاگیہ بدل بھی
جاتا ہے۔

ماں۔ اری اگر بھاگیہ بدل سکتا تو تیرے پتا کی دوڑ دھوپ کیوں بیکار جاتی؟ نگر
نگر پھر لئے۔ پر کوئی اچھا گھر نہ ملا۔ تیرے بھاگیہ میں تو وہ تیہیاں کا ہی لکھا
ہے۔

تارا۔ نہیں ماں۔ مَیں وہاں شادی کرنا نہیں چاہتی۔ میری شادی وہاں نہ کرو۔

ماں۔ اری کون ماں ہے، جو اپنی بیٹی کو تھیجیاں والے کو دینا چاہے گی۔ وہاں ہاں تو کر دی ہے، پر مجھے کیا معلوم کہ ہمیں گھڑی بھر کو چین نہیں ہے لیکن غریب کی بیٹی کو اچھا کون لیتا ہے۔

تارا۔ (سنبھل سنبھل کر) ماں، اگر کوئی اچھا ہو، پڑھا لکھا ہو، سندر ہو، سشیل ہو، اور مجھے لینا چاہتا ہو، تو کیا تم مجھے دے دوگی؟

ماں۔ (چونک کر) یہ کیا کہہ رہی ہے تو؟

تارا۔ (التجا کے لہجہ میں) ماں، میری زندگی بن سکتی ہے، مجھے بھی خوشی مل سکتی ہے۔ بنا جہیز کے میری شادی ایک اچھے گھر میں ہو سکتی ہے۔

ماں۔ (سکتہ اور خوف سے کانپ کر) تارا۔

تارا۔ ماں! تمہاری ایک ہاں سے میرے بھاگ بدل سکتے ہیں۔ نریش جی مجھ سے بیاہ کرنے کو تیار ہیں۔

ماں۔ تارا۔

تارا۔ ماں، میری اُن سے شادی کر دو۔

ماں۔ اُس کھتری ماسٹر سے؟

تارا۔ ماں، اُن کی ذات مت دیکھو۔ ناد پار لگانے والے مانجھی کی ذات کون دیکھتا ہے۔

ماں۔ ذات نہ دیکھوں، کُجات کو جنوائی بنا لوں؟

تارا۔ ماں، جو اچھا ہے، نیک ہے، خوبصورت ہے، وہ کُجات نہیں ہو سکتا۔ مجھے ان سے بیاہ دو۔ مجھے تمہارا ذات والا ادھیڑ آدمی نہیں چاہیئے۔

ماں۔ (بپھر کر) ارے بے حیا، کلنکنی، تو یہاں تک بڑھ گئی۔ تو نے ایک پرائے آدمی سے اپنے بیاہ کی باتیں کیں؟

تارا۔ ہاں ماں، میں نے اُن سے باتیں کی ہیں۔

ماں۔ اور تُو شرم سے زمین میں گڑھ نہ گئی؟ لاج سے مر نہ گئی؟

تارا۔ ماں، مَیں تم کو ناراض کرنا نہیں چاہتی، لیکن ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو تم نے بھی تو میری شادی کی بات پرائے آدمیوں سے کی ہے؟ اگر مَیں نے بات کی ہے، اپنی بگڑی بنانے کی کوشش کی ہے، تو کون سا پاپ کیا ہے؟

ماں۔ کونسا پاپ کیا ہے؟ اری تُو نے سارے خاندان کی ناک کاٹ ڈالی آج تک ہمارے کُل میں کسی لڑکی نے مُنہ نہیں کھولا۔ بیاہ کی بات زبان پر نہیں لائی۔ ستیوں کی طرح......

تارا۔ ماں، مَیں ستی بننا چاہتی۔ جانتے بُوجھتے، اندھے لُولے اور کوڑھی سے شادی کر کے مجھے ستی کا بیش نہیں کمانا۔ آنکھیں ہوتے ہُوئے سیدھے جا کر کھائی میں گر جانے کو مَیں عورت کی مہانتا نہیں مانتی، ماں ـــــ مَن مار کر اور ساری عُمر رو کر زندگی گزارنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔

ماں۔ (نفرت اور غصہ سے) تجھے تو اُس کھتری کے بیٹے سے بیاہ کرنا اچھا لگتا ہے۔

تارا۔ ماں، اس بات کو تم دُوسری طرح کیوں نہیں سوچتی؟ ذرا سوچو تو کہ تم کیا چاہتی ہو؟ تم بھی تو اُس بوڑھے براہمن سے میری شادی طے کر کے خوش نہیں ہو، صرف غریبی کے ہاتھوں مجبور ہو۔ اگر مجبوری کا حل نکلتا ہے، راستہ اور روشنی نظر آتی ہے، آنسوؤں کے بدلے مسکراہٹ ملتی ہے، تو اسے کیوں ٹھکراتی ہو؟

ماں۔ مَیں اپنے دھرم کو گنوا کر اور اپنی ذات کو کھو کر.......

تارا۔ (تیزی سے) ماں، میرے لیے دھرم اور ذات کی بات مت کرو۔ جو دھرم اور ذات میرے لئے ایک بُوڑھے بدصورت اور بیمار انسان کی صورت میں

آتا ہے، مجھے اچھا نہیں لگتا۔ مَیں اس دھرم کا کیا کروں، جو مجھے رُلائے، وقت سے پہلے بیوہ بنانے اور میری ہنسی خوشی کا دِیا بجھانے آتا ہے۔

ماں۔ تو تُو دھرم سے اس حد تک گر گئی؟ پڑھ لکھ کر تُو نے یہ سیکھا ہے؟ مَیں نے تجھے ڈھیل دی، اس کا تُو نے یہ فائدہ اُٹھایا ہے؟ (غضب ناک ہوکر) پر ناگن مَیں تجھے ڈسنے نہیں دُوں گی، کُل کو کلنک لگانے نہ دُوں گی۔ اس سے پہلے کہ تُو سر اُٹھائے، مَیں تیرا سر کچل دُوں گی۔ تجھے مار کر دھرتی میں گاڑھ دُوں گی۔

(فلیش بیک ختم)

تارا۔ اور ماں نے مجھے مارا، پتاجی نے غصّہ میں آکر میرا گلہ دبانا چاہا۔ مجھے معلوم ہوگیا، وہ گھر آیا ناگ نہ پوجیں گے۔ بانبی کے ناگ کو بلانے کے لئے بین بجا بجا کر مرجائیں گے۔ وہ بیٹی کے غم میں روتے رہیں گے، لیکن اس خوشی کی خاطر سماج کی دو باتیں سننے کی ہمّت نہ کریں گے۔ ان کا فیصلہ یہ تھا، مجھے فیصلہ کرنا تھا۔ ایک طرف ایک بوڑھے براہمن کے ساتھ عمر قید تھی، دُوسری طرف تم پنجرے کا دروازہ کھولے مجھے کھُلا آسمان دکھا رہے تھے۔ ایک ذرا سی ہمت کرنے سے، ایک چھوٹا سا قدم اُٹھانے سے میری زندگی بنتی تھی۔ لیکن مَیں نے پایا، مَیں بھی اپنے ماں باپ کی طرح بُزدل ہُوں۔ مَیں نے اس ادھیڑ آدمی سے شادی کرنا منظور کرلیا، جس کی دو بیویاں مر چکی تھیں، اور جسے دل کا مرض تھا۔

نرلیش۔ یہ سب کچھ تم نے کیسے سہا ہوگا تارا؟

تارا۔ نرلیش، آدمی کا من بڑا چھلیا ہوتا ہے۔ ہر چیز کو سہنے کا بہانہ ڈھونڈ نکالتا

ہے۔ جب میری شادی ہو گئی، تو مَیں نے ایک عجیب نراشش بھری آس کا سہارا لیا۔ مَیں نے سوچا، اب مجھے جینا ہی کتنے دن ہے۔ اس آدمی کی پہلی دو عورتوں کی طرح مَیں بھی جلا مر جاؤں گی۔ اس کا دا سے مُکتی پا جاؤں گی۔ جینے کی نہیں، مرنے کی، آس میں زندگی کے دِن پُورے کرنے لگی۔ مَیں نہ ہنستی نہ بولتی۔ نہ اچھا کھاتی نہ پہنتی۔ لیکن نرلیش، مَیں اپنے اس ارادہ میں کامیاب نہ ہو سکی۔ ایک دن اپنی خواہش اور کوشش کے باوجود مَیں ایک لڑکے کی ماں بن گئی۔ ایک ننھی سی جان نے میرے تن سے چمٹ کر مجھ سے پیار اور ممتا کی مانگ کی، اور مَیں اُسے اِنکار نہ کر سکی۔ مَیں نے اُسے اپنے سینہ سے لگا لیا۔ اس نے مجھ میں پناہ لی۔ مَیں نے اُس میں پناہ لی۔ کچھ مہینوں کے لئے مَیں سب کچھ بھول گئی۔ لیکن صرف کچھ مہینوں کے لئے۔ کیونکہ اس کے بعد مَیں بیوہ ہو گئی۔

نرلیش۔ (جذباتی انداز میں) تارا۔

تارا۔ ہاں نرلیش۔ لیکن مجھے دُکھ نہ ہُوا۔ آنکھ سے آنسو بھی نہ بہے۔ من کی بستی بسی کب تھی، جو اُجڑنے کا غم ہوتا۔ جیسے ایک دِن ماں باپ کے گھر سے نکلی تھی، ویسے ہی کپڑوں کی ایک گٹھڑی اور ایک دو ٹرنک لے کر بچے کے گھر سے نکل پڑی۔ سسرال میں اور کوئی نہ تھا، اس لئے پھر واپس ماں باپ کے گھر آ گئی۔ لیکن اب کی بار مَیں وہ گائے نہ تھی، جس کا رسّا کھول کر کبھی کے ہاتھ میں دیا جا سکتا۔ اب کے مَیں پتھر کی ایک سِل بن گئی تھی، جو ماں باپ اور بھائی بھاوج کی چھاتی پر آ کر ہمیشہ کے لئے رکھی گئی۔ بہت جلد وُہ اس سِل کا بوجھ محسوس کرنے لگے۔

(فلیش بیک شروع)

بھابی۔ دیکھو۔ میں آج اینٹ کا گھر مٹی کر کے رکھ دوں گی، بتاؤ دودھ کہاں گیا؟
کس نے لیا؟ تارا؟

تارا۔ میں کہہ تو رہی ہوں بھابی۔ میں نے نہیں لیا۔

ماں۔ کیا ہوا بہو؟ ارے کیا ہوا تارا؟

تارا۔ ماں، بھابی دودھ رکھ گئیں تھیں۔ اب برتن خالی ہے۔ کہتی ہیں، بتاؤ کس نے
لیا۔

ماں۔ تو نے تو نہیں لیا؟

تارا۔ نہیں ماں۔ میں نے صبح بھابی ہی سے لیا تھا۔

ماں۔ تو بہو، بلی پی گئی ہوگی۔

بھابی۔ اس بلی ہی کا تو مجھے پتہ لگانا ہے۔ وہ کونسی بلی ہے اور کس بلی کے بچے کو پلاتی
ہے۔ میں مہینے بھر سے دیکھ رہی ہوں کہ جتنا دودھ رکھتی ہوں، آدھا رہ جاتا
ہے۔ میرے بچے بھوک کے بلکتے رہ جاتے ہیں، اور دنیا کے بچے پیٹ بھر کر سوتے
ہیں، اور موٹے ہو رہے ہیں۔

ماں۔ (مجروح ہوکر) بہو —— یہ تو کیا کہہ رہی ہے۔ یہ تیری نند ہے۔

بھابی۔ ہوا کرے۔ اگر نند ہی بھاوج کے بچوں کی بیرن بن جائے گی، تو بھاوج کب
تک چپ رہے گی۔ میں اب چپ نہیں رہ سکتی۔ میں صاف صاف کہوں گی۔
یہ دودھ چرا کر اپنے بچے کو پلاتی ہے۔

تارا۔ (صدمہ کے لہجہ میں) بھابی۔

بھابی۔ ہاں۔ ہاں۔ تو میرے بچوں کا دودھ چرا کر اپنے بچے کو پلاتی ہے۔

تارا۔ تم قسم کھا کر کہہ سکتی ہو؟

بھابی۔ قسم ؟ ارے میرا مال اور مَیں ہی قسم کھاؤں ؟ اور مَیں کس کی قسم کھاؤں ؟
اپنے آدمی کی ؟ ارے اپنے آدمی کو تو تُو کھا آئی، اب میرے آدمی کو بھی
کھانا چاہتی ہے ؟ ارے کچھ شرم تو کرو، جس کی کمائی کھاتے ہو، جس کی
روٹیاں توڑتے ہو، اس کی جان کے پیچھے پڑے ہو ؟ اس کے بچے کو بھوکا
مار رہے ہو۔

(بھائی اندر داخل ہوتا ہے)

بھائی۔ یہ کیا جھگڑا ہے ؟

بھابی۔ جھگڑا کچھ نہیں ہے۔ بس تم مجھے اور میرے بچوں کو میرے میکے بھیج دو۔ ہم
بھوکے رہ لیں گے، بھیک مانگ لیں گے .....

ماں۔ بہو، بات کا بتنگڑ کیوں بنا رہی ہے ــــ تجھے نکل جانے کو کس نے کہا ہے ؟

بھابی۔ ارے آج اگر ماں بیٹی مل کر میرے بچوں کے منہ کا نوالا چھیننے پہ تُل گئی ہو، تو
ایک دن گھر سے نکال کر بھی دم لوگی ۔

بھائی۔ تو کیا آج بھی اس نے منّے کا دودھ چرایا ؟

تارا۔ (حیرت اور صدمہ سے) بھیا۔

بھائی۔ (غضب ناک ہو کر) بس، میری آنکھوں کے سامنے سے دور ہو جاؤ۔ یہ ایک
مہینے سے بتا رہی تھی، کہ منّے کا دودھ کم ہو جاتا ہے۔ لیکن مَیں خاموش
تھا۔

ماں۔ لیکن یہ جھوٹ ہے بیٹا۔

بھائی۔ یہ جھوٹ ہے ؟ اب یہ جھوٹی بھی ہو گئی، تمہیں شرم نہیں آتی۔ یہ عورت اپنی
خواہش مار کر، اپنے بچوں کا تن پیٹ کاٹ کر، ڈیڑھ سو روپے میں تم
سب کو کھلا رہی ہے، تم پہ مانس چڑھا رہی ہے، اور تم اسے جھوٹی کہتی ہو؟

تارا۔ بھیا۔
بھائی۔ بس، آج کے بعد اگر مجھے بھیا کہہ کر پکارا ـــــ جو عورت اپنے بھائی کے بچوں کے ساتھ دغا کر سکتی ہے، وہ عورت نہیں، ڈائن ہے۔
(فلیش بیک ختم)

تارا۔ مَیں عورت سے "داسی" اور "ڈائن" سے مہری کہاری بن گئی۔ مجھ سے دن بھر کڑا کام لیا جاتا، اور اس کے عوض شام کو کڑوے بول اور روٹی کے سُو کھے ٹکڑے دیئے جاتے۔ میرے بچّے کی حالت مجھ سے بھی زیادہ خراب کر دی گئی۔ اس کا دُودھ بند کر دیا گیا۔ بیمار ہوتا تو دَوا لاکر نہ دی جاتی۔ روتا تو اُٹھانے کی مہلت نہ دی جاتی۔ جہاں اسے گود میں اُٹھاتی، بھابی فوراً کوئی کام بتا دیتی مَیں کام میں لگ جاتی، وہ دھرتی پر پڑا روتا رہتا۔ جب روتے روتے نڈھال ہو جاتا، تو آپ ہی سرد اور ننگے فرش پر سُکڑ کر سو جاتا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر میری آتما پر آرے سے چلتے۔ لیکن مَیں کیسے، کیا کہتی۔ بیوہ بیٹی کُل کے لئے شراپ ہوتی ہے۔
نرلیش۔ (احتجاج کرتے ہُوئے) یہ غلط ہے تارا۔
تارا۔ آج یہ غلط ہے نرلیش، پر اُن دنوں صحیح تھا۔ اس لئے گھر والوں نے ایک بار پھر مجھے ٹالنے کی فکر کرنا شروع کی۔ بھائی بھاوج نے ایک کارن، ماں باپ نے دُوسرے کارن۔
(اسٹیج پر اندھیرا چھا جانے کے بعد آرک لیمپ کی روشنی میں بھائی اور اس کی بھاوج باتیں کرتے نظر آتے ہیں۔
بھابی۔ دیکھو، اس طرح گھر نہ چلے گا۔

بھائی۔ (دبے لہجہ میں) یہ میں بھی دیکھ رہا ہوں رانی لیکن میں کیا کروں؟ ماں باپ بُوڑھے ہیں۔

بھابی۔ میں ماں باپ کی نہیں کہہ رہی، میں تمہاری بہن کے لئے کہہ رہی ہوں۔

بھائی۔ لیکن اب وہ بھی کہاں جا سکتی ہے رانی۔ وہ تو عمر بھر اب یہیں رہے گی۔

بھابی۔ عُمر بھر کیوں رہے گی؟

بھائی۔ بیوہ کہاں جائے گی؟ وہ کہاں جا سکتی ہے۔ گھر سے تو نہیں نکال سکتے۔

بھابی۔ پر میں گھر سے نکالنے کو کب کہتی ہوں۔ میں تو اس کا بیاہ کرنے کو کہتی ہوں۔

بھائی۔ (چونک کر) دُوسرا بیاہ؟

بھابی۔ ہاں چونکتے کیوں ہو؟ سوچو تو اس کی عمر کیا ہے؟ ساری عمر گھر میں بٹھا کر کھلا سکو گے؟ (سرگوشی کے شیطانی لہجہ میں) اور اس بیچ میں اگر کہیں کچھ بُرا بھلا کر گذری ......

بھائی۔ (بھائی پن کا جوش آجاتا ہے) رانی، تارا میری بہن ہے۔

بھابی۔ (بلا خوف کھائے) تبھی کہہ رہی ہوں۔ تمہاری بہن اور تمہاری بیٹیوں کی عزّت الگ نہیں ہے۔ اگر ایک کی ناک کٹی، تو سب کی کٹ جائیگی۔ شادی سے پہلے اس کھتری ماسٹر والا قصّہ بھول گئے؟

بھائی۔ (گھبرا کر) رانی۔

بھابی۔ اس لئے کہہ رہی ہوں، بتاشہ گھُلتے دیر نہیں لگتی۔

بھائی۔ لیکن اب اس کی شادی کیسے ہو سکتی ہے۔ اسے ایک بچے والی بیوہ کو لے گا کون؟

بھابی۔ لینے والا تیلی تنبولی مل ہی جائے گا۔ اس کو ڈھو کو گھر میں رکھنے سے یہی اچھا ہے کہ ......

بھائی۔ (اندر گھبرا کر) اچھا۔ اچھا ..... اس وقت بس کر ..... اس وقت سو جانے دے۔ صبح پتا جی سے بات کروں گا۔

(آرک لیمپ گل ہو جائے۔ دوبارہ جب آرک لیمپ روشن ہو، تو ماں باپ بیٹھے نظر آتے ہیں)

ماں۔ اب اس ابھاگن کا دکھ مجھ سے نہیں دیکھا جاتا۔

باپ۔ تو بتا، مَیں کیا کروں؟ مَیں نے تو اس کا بیاہ کر دیا تھا۔ لیکن تیرے اور میرے پھوٹے بھاگ کہ......

ماں۔ بھاگ تمہارے ہمارے کیا پھوٹے ہیں، بھاگ تو اس کے پھوٹے ہیں۔ ہم تو دُکھ سُکھ میں دس پانچ سال کاٹ کر چلے جائیں گے، لیکن اس کا کیا ہو گا؟

باپ۔ ہو گا کیا۔ اسی طرح دن کاٹے گی۔

ماں۔ مہری کہاری کی طرح کام کر کے اور بھائی بھاوج کی جوتیاں کھا کر؟ دیکھنا اس طرح اس کے دن نہیں کٹیں گے۔ دیکھا دھواں سی کالی ہو گئی ہے۔

باپ۔ سب دیکھ رہا ہوں تارا کی ماں، سب دیکھ رہا ہوں۔ لیکن کیا کروں، مَیں بوڑھا بے کار کیا کر سکتا ہوں۔

ماں۔ اس کا بیاہ کر دو۔

باپ۔ (چونک کر) کیا؟

ماں۔ اس کا پنر بیاہ کر دو۔

باپ۔ تو پاگل تو نہیں ہو گئی ہے، اس بڑھاپے میں ......

ماں۔ ابھی تو پاگل نہیں ہوں۔ لیکن اگر اس کا بیاہ نہ ہوا، تو پاگل ضرور ہو جاؤں گی۔ اگر اس کا بیاہ نہیں کرنا تو مجھے زہر لا کر دے دو۔ اس کی حالت مجھ سے نہیں دیکھی جاتی۔

باپ۔ تارا کی ماں چپ ہو جا۔ میرے دھرم کا بندھن مت توڑ۔ مَیں سناتنی براہمن

ہوں میرے کُل ......

ماں۔ (بپھر کر) بس اب مجھ سے دھرم اور کُل کی بات مت کرو۔ ایک بار خود مَیں اس دھرم اور کُل پہ اپنی بیٹی کی بلی دے چکی ہوں۔ یاد ہے تمہیں وہ کھتری لڑکا نریش۔ کتنا اچھا تھا۔ وہ تمہاری تارا سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ تارا نے خود مجھ سے کہا تھا، ماں بگڑی بن سکتی ہے، بھاگ بدل سکتا ہے۔ لیکن مَیں نہ مانی۔ اُس گھڑی اگر مَیں مان جاتی، تم مان جاتے۔ برادری سے ڈرنے کے بجائے تارا کا بیاہ اُس سے ......

باپ۔ بس، بس۔ تارا کی ماں۔ اور زیادہ مت کہہ۔ زندگی میں لے دے کر ایک دھرم ہی رہ گیا جس کے سہارے جی رہا ہوں۔ اگر تُو نے اور زیادہ کہا، تو یہ بھی جاتا رہے گا۔

ماں۔ (آخری طور پر بغاوت کر کے) یہ چلا ہی جائے تو اچھا ہے۔ اس دھرم نے تو میری بیٹی کی زندگی لے لی۔ اس نے اس کا سُہاگ لے لیا۔ اب مجھے اس دھرم سے، اِس برادری سے کچھ نہیں لینا۔ مَیں اپنی بیٹی کا پُنر بیاہ کروں گی۔ ناک کٹتی ہے تو کٹ جائے، میری بیٹی کی زندگی تو کٹ جائے گی۔

(آرک لیمپ کی روشنی گُل ہونے کے بعد جب روشنی ہو۔ تو تارا اور نریش پھر بیٹھے دکھائی دیں۔)

تارا۔ بالآخر ماں نے اس روشنی اور اِس راستہ کو دیکھا، جو مَیں نے اسے کبھی دکھانا چاہا تھا۔ لیکن کتنی دیر بعد۔ کتنا دُکھ دینے اور سہنے کے بعد۔ جس دن مَیں نے ماں کو یہ کہتے سُنا تھا۔ نریش، مَیں تمہیں یاد کر کے کتنا روتی تھی۔ ہائے یہ سب کچھ پہلے کیوں نہ ہو گیا۔ ماں کو پہلے سوجھی کیوں نہ آ گئی۔ مَیں نے تم کو یُوں نراش کیوں کیا۔ کاش ——— اور اس دن اتا پاس نہ جانے مَیں

نے کیا کیا سپنے دیکھ ڈالے۔ کیسی ایک ظالم خیال نے آکر میرے سپنوں کو توڑ ڈالا۔' وہ اب مجھ سے شادی کریں گے ؟ ــــ ایک بیوہ سے ؟ ایک بچے والی عورت سے ؟ مجھ میں اب رہ کیا گیا ہے ؟'

نریش۔ تم نے میرے لئے ایسا سوچا؟ تارا! تم مجھے آزما کر تو دیکھتیں۔ ایک بار خط لکھ کر تو دیکھتیں۔

تارا۔ تمہارا پتہ میرے پاس کہاں تھا؟ تم اپنا پتہ کسی کے پاس نہ چھوڑ گئے تھے۔ اور پتہ ہوتا بھی، تو میں تمہیں کس منہ سے لکھتی؟ اس لئے اس کی جو بجلی میری دنیا میں چمکی تھی، وہ مجھے اور اندھا کر کے چھوڑ گئی۔ اُدھر میری ماں کی عجیب حالت تھی۔ پہلے انہیں روشنی نہ دیکھتی تھی، اب انہیں اندھیرا دکھتا تھا۔ اب وہ ہر کسی سے میری شادی کرنے پر تُل گئی تھیں۔ اس لئے ایک دن جب میری بھابی میرے لئے ایک بر ڈھونڈ کر لائیں، تو انہیں منظور کرنے میں کوئی خاص اعتراض نہ ہوا۔

(اسٹیج پر اندھیرا چھا جائے۔ پھر آرک لیمپ کی روشنی میں تارا کی ماں اور بھابی بات کرتے نظر آئیں۔)

ماں۔ بہو، بر کیسا ہے؟

بھابی۔ ماں جی، آپ نے پہلا بھی ایسا نہ ڈھونڈا، جیسا میں نے دوسرا ڈھونڈا ہے۔ عمر کا بس چالیس، جسم کا گٹھا، پشتوں میں بیماری سے کوئی نہ مرا۔ جات کا براہمن۔ شادی ایک ہوئی ہے، نہ باپ، نہ بھائی، نہ بہن۔ بس میاں ہے۔ یا تو رو ہوگی۔

ماں۔ کرتا کیا ہے ؟

بھابی۔ پان کی دکان ؟

ماں۔ (مرے دل سے) پان کی ؟

بھابی۔ تو کیا ہُوا۔ وہ جو آپ نے ڈھونڈا تھا، وہ تو پُجاری تھا۔ حرام کی کھاتا تھا۔
ماں۔ (عجلت سے گھبرا کر) نا۔ نا بہو میں یہ نہیں کہتی۔ مَیں تو بس یہ کہوں ہوں۔ کہ
اس ابھاگن کو ایسے ٹھکانے بٹھا دے کہ اس کی عمر کٹ جائے۔
بھابی۔ ہم کو آپ سے زیادہ فکر ہے، ماں جی۔ ہمارے خزانہ تھیں گڑا تھا کہ کھود
کھود کر اسے ساری عمر کھلاتے رہیں گے۔ اسے ٹالنے کی خاطر تو مَیں نے
مان لیا کہ یہ لڑکا ساتھ نہ بھیجیں گے۔
ماں۔ (چونک کر) کیا لڑکا تارا کے ساتھ نہ جائے گا؟
بھابی۔ ماں جی، کوئی ماس کھاتا ہے، تو گلے میں ہڈی نہیں ڈال لیتا۔ اس نے صاف
کہہ دیا کہ بیوہ سے بیاہ کر لوں گا، پر اسکی اولاد کو گھر میں نہ لاؤں گا۔ وہ تو
اس بات پر اچھل گیا تھا۔ بڑی مشکل سے راضی کیا، کہ بیاہ کر لو، لڑکا ہم
رکھ لیں گے۔
ماں۔ تو بچے کو تم رکھ لو گی؟
بھابی۔ (بڑی شیطانی چال دکھا کر) کیوں، نہ رکھوں گی؟ میرا کیا کھائے گا۔ ماما
کی کمائی میں بھانجے کا حصّہ نہیں ہوتا کیا؟
(آرک لیمپ کی روشنی بجھ جائے۔ اسٹیج
پر پھر اُجالا ہو جائے)
تارا۔ مجھے ٹالنے کی دُھن میں بھابی نے بچّے کو رکھنا اور ماں باپ اور بھائی نے
ایک پان والے سے میرا رشتہ کرنا منظور کر لیا۔ لیکن میری آتما کراہ اٹھی۔ مَیں
لاکھ دُکھ میں تھی ولیکن مَیں بیاہ کرنا نہ چاہتی تھی۔ میرا من سدا کے لئے مر
چکا تھا۔ مَیں محض بچے کے لئے جینے جا رہی تھی۔ بچّہ سے الگ ہونے کا مَیں
تصوّر بھی نہ کر سکتی۔ جو لوگ میرے ہوتے ہوئے میرے بچّے کو اس حالت

میں رکھتے تھے، وہ میرے پیچھے تو اُسے مار ہی ڈالیں گے۔ اس لئے میں نے گڑگڑا کر اپنی ماں سے دوبارہ اپنی زندگی کی، اپنی خوشی کی بھیک مانگی۔

(روشنیاں گل ہو جاتی ہیں، اور آرک لیمپ کی روشنی میں تارا اور اس کی ماں نظر آتی ہیں۔)

تارا۔ ماں، تو میری دوسری شادی نہ کر۔ ایک بار اپنی ہٹ پر جم کر تو نے میری زندگی برباد کر دی، اس بار تو مجھے بخش دے۔

ماں۔ نہیں تارا۔ میں نے تیرے ساتھ جو بُرا کیا ہے، میں اُسے اچھا کر کے رہوں گی میں نے تیرا سُہاگ لوٹا ہے، میں دوبارا تیرا سُہاگ بسا کر رہوں گی۔

تارا۔ ماں، یہ میرا سُہاگ بسانا نہیں ہے، میری رہی سہی خوشی ختم کرنا ہے۔

ماں۔ نہیں تارا، تو نہیں جانتی، بیاہ کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تو خوش ہو سکے گی، پھل پھول سکے گی، یہاں اس گھر میں تیری گزر نہیں۔ یہ تیرے بھائی بھاوج تجھے نوچ کر کھا جائیں گے۔

تارا۔ ماں، مجھے یہاں ان کے ہاتھوں مرنا منظور ہے، لیکن میں بچے کو چھوڑ کر نہیں نہ جاؤں گی۔

ماں۔ اوہ، تو تجھے پتہ لگ گیا کہ تیرے آدمی نے بچہ لینے سے انکار کر دیا ہے۔ لیکن تارا تو نہ گھبرا۔ شروع شروع میں سب مرد ایسے ہی کہتے ہیں۔ لیکن جب تو اس کے گھر جائے گی، اُسے تجھ سے موہ ہو جائے گا۔ تو وہ تیری بات مان جائے گا۔

تارا۔ نہیں ماں، یہ سب من بہلاوا ہے۔ میں جانتی ہوں، کوئی مرد دوسرے مرد کے بچے کو نہیں اپنا سکتا۔ اور مجھے معلوم ہے کہ یہاں میرے پیچھے میرے بچے کی کیا حالت ہوگی۔

ماں - اس بات سے تو نہ گھبرا تارا - تیری بھابی نے بچہ رکھنے کا وعدہ کر لیا ہے۔ وہ اسے اچھا رکھے گی - اور پھر میں جو ہوں -

تارا - ماں یہ سب مجھے بہلانے، دھکا دینے کے لئے ہے - تم سب مجھے ٹالنا، دفع کرنا چاہتے ہو، اس لئے دلاسا دے رہے ہو۔ لیکن میں اپنے بچے کو نہیں چھوڑوں گی - اگر تم مجھے نہیں رکھنا چاہتے، میں تم پہ بوجھ ہوں، تو مجھے نکال دو، زہر دے دو، لیکن میری شادی نہ کرو -

(آرک لیمپ کی روشنی بجھ جائے - اسٹیج کی روشنی جل جائیں -)

تارا - میں خوب روئی اور چلائی، لیکن رونے سے بھاگ کب بدلتا ہے - رونا بیکار رہا - اور ایک بار پھر میری شادی کر دی گئی، میں بچہ کو روتا بلکھتا چھوڑ کر سسرال چلی گئی - لیکن بچہ کا خیال میں اپنے دل سے دور نہ کر سکی - اپنے پتی کے گھر پہنچتے ہی مجھے بچے کی یاد بُری طرح ستانے لگی - اس کے رونے کی آواز میرے کانوں میں گونجنے لگی - اس کی بھوک اور غم سے نڈھال بے بس صورت میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگی - اس کے ہاتھ میں اپنے چہرے اور سینہ پر محسوس کرنے لگی - اور مجھے محسوس ہوا، میں اس کے بنا رہ نہ سکوں گی - میں نے بے تاب ہو کر پتی کے پاؤں پکڑ لئے اور اپنی زندگی کی آخری خوشی کی بھیک مانگی -

(اسٹیج اندھیرا ہو جائے، آرک لیمپ کی روشنی میں تارا اور اس کا شوہر نظر آئیں)

تارا - میں آپ سے صرف ایک بھیک مانگتی ہوں، میرے بچے کو مجھ سے الگ نہ کرو، اُسے یہاں لے آنے دو -

پتی۔ (غضب ناک ہوکر) کیا کہا؟ بچے کو؟ تیرے اس پہلے آدمی کے بچے کو؟ دیکھ
میں بڑا غصیل آدمی ہوں۔ آج کے بعد اگر بچے کا یا اپنے پہلے آدمی کا نام
لیا تو.....

تارا۔ میں اپنے پہلے آدمی کا نام نہیں لے رہی۔ میں اس کا کبھی نام نہ لوں گی۔
بس صرف بچے کی.......

پتی۔ میں اسی کی بات کہہ رہا ہوں۔ مجھے اس پلے سے کوئی مطلب نہیں۔ میں نے
تیری بھابی سے صاف کہہ دیا تھا اگر تو بچے کو لائی، تو میں اسے پتھر پہ پٹخ کر....

تارا۔ (کانپ کر) ایسے نہ کہو، ایسے نہ کہو۔ اس ننھی سی کا یا پہ رحم کھاؤ۔ اس کا اب
اس دنیا میں کوئی نہیں۔ میرے بنا وہ جی نہ سکے گا۔

پتی۔ نہ جئے، تو اچھا۔ کل کا مرتا آج مر جائے، مجھے اس سے کیا؟

تارا۔ نہیں نہیں۔ وہ میرے ماس کا ٹکڑا ہے۔ اس میں میری آتما کا تار اٹکا ہوا ہے۔
اگر وہ دکھی رہا، اسے کچھ ہو گیا، تو میں خوش نہ رہ سکوں گی۔ میں جیتے جی
مر جاؤں گی۔

پتی۔ اب، تو جیتے جی نہیں، سچ مچ مر جا۔ لگائی تو میرے لئے پاؤں کی جوتی ہے۔
ایک پھٹی، دوسری لے آؤں گا۔ لیکن جب تک جیتی ہے، ایک بات یاد رکھ۔
اس کے بعد اگر تو نے یہ ذکر چھیڑا، تو مجھ سے برا نہ ہوگا۔ میں تمباکو کی طرح کڑوا
اور چونے کی طرح تیز آدمی ہوں۔

(آرک لیمپ کی روشنی بجھ جائے اور
اسٹیج پہ پھر روشنی ہو جائے۔)

تارا۔ وہ سچ مچ تمباکو کی طرح کڑوا اور چونے کی طرح تیز تھا۔ چونکہ پان بیچتے ہوئے
اس نے یہی سیکھا تھا کہ جو نرم، ملائم اور لچیلا ہوتا ہے، وہ گھٹیا پان

ہوتا ہے، اس لیئے وہ بھول ہی گیا تھا، کہ نرمی، کو ملنا اور لچک بھی اچھی چیزیں ہوتی ہیں۔ وہ ہر چیز کو پان کی طرح کونے پر سے موڑ کر اور توڑ کر دیکھتا تھا۔ اس لیئے اس نے مجھے انسان نہ سمجھا، پان کا پتا ہی سمجھا۔ جس طرح وہ پان کے سڑے ہوئے حصّہ کو کاٹ کر پھینک دیتا تھا، اسی طرح اس نے میری پُرانی زندگی اور میرے بچّے کو مجھ سے کاٹ کر پھینکنا چاہا۔ وہ میرا بچّہ لینے پر راضی نہ ہُوا۔ اس نے میرا گھر جانا بند کر دیا۔ اگر مَیں بہت روتی دھوتی، تو میرے ساتھ جاتا اور مجھے اپنے ساتھ لے آتا۔ اس کے علاوہ وہ میری ہر بات میں، میرے پہلے پتی کی پرچھائیں دیکھتا۔ اگر مَیں اُداس ہوتی، یا میری آنکھ بھر آتی، تو وہ سمجھتا، مجھے پہلے پتی کی یاد آ رہی ہے۔ اس لیئے وہ مجھے مارتا، اِدھر بھائی نے بچّے کا بُرا حال کر دیا تھا۔ پہلے مہینہ ہی وہ آدھا رہ گیا۔ پھر بیمار رہنے لگا۔ ایک دِن مجھے پتہ لگا، کہ اُس کو سخت بخار ہو گیا ہے۔ مَیں نے اُسے دیکھنے کے لیئے جانا چاہا، لیکن میرے پتی نے مجھے جانے نہ دیا، پر مَیں رُک نہ سکی۔ جیسے ہی وہ دکان گیا، مَیں چوری سے اُسے دیکھنے چل دی، اُسے قے دست لگے ہُوئے تھے، اور ٹھنڈے پسینے آ رہے تھے۔ گھر میں بھائی یا پتاجی نہ تھے۔ اس لیئے مَیں نے پڑوس کے ایک لڑکے کو بُلایا۔ لیکن عین اُس وقت جب دروازہ میں کھڑی ہُوئی مَیں اُسے دوا کے لیئے روپیے دے رہی تھی، میرا پتی آ گیا۔ اس نے سمجھا مَیں اُسے روپے دے نہیں رہی بلکہ لے رہی ہوں۔ بس پھر کیا تھا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ ایک تھپّڑ مار کر اُس نے اس لڑکے کو گرا دیا اور پُورے زور سے ایک لات میرے پیٹ پر ماری —— میرے جو اس کے تین مہینے کے بچّے کی ماں بن رہی تھی۔

نریش۔ لڑکی! اوہ —— تارا تم نے اِتنی سی ہمّت نہ کی اور اِتنا سارا ظلم سہہ لیا؟

تارا۔ ہاں نریش ـــــ لیکن یہ آخری چوٹ تھی، جو مَیں نے اس کے ہاتھوں کھائی۔ اس کے بعد میرے دُکھوں کا سدا کے لئے انت ہو گیا۔

نریش۔ سدا کے لئے؟

تارا۔ ہاں نریش۔ چوٹ کھا کر بیہوش ہونے کے بعد جب میری آنکھ کھُلی، تو مَیں نے اپنے کو اسپتال کے ایک کمرے میں پایا۔

(اسٹیج پر اندھیرا چھا جائے، اور پھر آرک لیمپ کی روشنی میں تارا اسپتال کے پلنگ پر لیٹی نظر آئے)

تارا۔ (کراہتے ہوئے) مَیں ..... مَیں کہاں ہوں؟

نرس۔ تم اسپتال میں ہو۔ گھبراؤ نہیں۔ اب تم ٹھیک ہو۔

تارا۔ پر مجھے ہُوا کیا تھا؟ مجھے بس اِتنا یاد ہے ..... اس نے میرے پیٹ پر لات ماری تھی۔

نرس۔ (چونک کر) تو اس نے ہم سے جھوٹ بولا تھا کہ تم چھت سے گر گئی تھیں۔ ڈاکٹر ٹھیک ہی کہتی تھیں کہ تم گری نہیں ہو۔ تمہیں معلوم ہے، ہماری ڈاکٹر تمہیں جانتی ہیں۔

تارا۔ (چونک کر) مجھے؟

نرس۔ ہاں، انہیں نے تمہاری جان بچائی تھی۔ لات پڑنے کی وجہ سے تمہارا بچہ پیٹ میں مر گیا۔ ڈاکٹر نے آپریشن کر کے اُسے نکالا، ورنہ تم مر جاتی۔

تارا۔ (گہرا سانس لے کر) کاش، مَیں مر جاتی۔

نرس۔ ایسا نہ کہو۔ زندگی بڑی قیمتی ہوتی ہے، لو ڈاکٹر آگئیں۔ ڈاکٹر انہیں ہوش آگیا۔

ڈاکٹر۔ Thank God۔ اب تم جاؤ۔ آرام کرو۔ مَیں اِن کے پاس بیٹھوں گی۔

نرس۔ بہت بہتر، ڈاکٹر۔ (چلی جاتی ہے)
ڈاکٹر۔ اب کیسی ہے تمہاری طبیعت، مجھے پہچانتی ہو؟
تارا۔ آپ کو؟
ڈاکٹر۔ ہاں۔
تارا۔ (بجھے لہجے میں) نہیں ......
ڈاکٹر۔ یہ تمہارے ماتھے پر جو چوٹ کا نشان ہے، یاد ہے، بچپن میں کس نے ڈالا تھا؟
تارا۔ ایک لڑکی نے، بملا نے۔
ڈاکٹر۔ اب مجھے دیکھو۔
تارا۔ بملا؟ بملا، تم؟
ڈاکٹر۔ ہاں تارا۔ مَیں وہی بملا ہوں، جس نے اسکول میں تمہیں کبھی دھکّا دیا تھا۔
لیکن آج مَیں نے بدلا چکا دیا۔
تارا۔ (خوشی سے) بملا (لیکن فوراً ہی اُداس ہو کر) لیکن بملا، کاش تم نے مجھے
مر جانے دیا ہوتا۔
ڈاکٹر۔ مَیں نے ڈاکٹری اس لئے تو نہیں سیکھی تھی کہ ایک سہیلی کو اتنے برسوں کے
بعد پا کر کھو دیتی۔
تارا۔ لیکن مَیں جتنی دُکھی ہوں بملا، اگر تجھے معلوم ....
ڈاکٹر۔ مجھے —— معلوم ہو گیا ہے تارا۔ تمہاری ماں سے مجھے سب کچھ معلوم ہو
گیا ہے۔ تمہارا بچّہ بھی اسی اسپتال میں ہے۔
تارا۔ میرا بچّہ کیا؟ کیا وہ ابھی تک۔
ڈاکٹر۔ زندہ ہے، اور زندہ رہے گا تارا، اور تم بھی زندہ رہو گی۔
تارا۔ مَیں؟ .... نہیں بملا، مَیں اب کبھی زندہ نہیں ہو سکتی۔ مَیں جتنی بار مری

ہوں، مَیں نے جتنے گھاؤ کھائے ہیں، جتنے زہر کے پیالے پیئے ہیں.....

ڈاکٹر۔ وہ سب تیری کمزوری کے کارن تھے۔ تارا تُو نے خود اپنے کو تباہ کیا ہے۔

تارا۔ ہاں بملا۔ لیکن ایک عورت کیا کر سکتی ہے۔ مَیں کیا کر سکتی تھی؟

ڈاکٹر۔ تو؟ تُو سب کچھ کر سکتی تھی۔ تارا تو نے میٹرک پاس کر لیا تھا۔ تو اپنی زندگی آپ بنا سکتی تھی۔ اکیلی اپنے قدموں پر کھڑی ہو سکتی تھی۔

تارا۔ شائد..... بملا۔ شائد۔ یہ سب کچھ ہو سکتا تھا۔ لیکن اب.....اب کیا ہو سکتا ہے۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر۔ تارا، تُو مریض کی طرح بول رہی ہے، ڈاکٹر کی طرح نہیں۔ تجھے معلوم ہے کہ ہم آدمی کو موت کے راستے سے لوٹا لاتے ہیں۔

تارا۔ لیکن مجھے کوئی نہیں لوٹا سکتا۔ میری زندگی کا اب کوئی انجام نہیں ہو سکتا۔ اس کا تو بس انت ہوگا۔

ڈاکٹر۔ مگر کیوں؟ کس لئے؟

تارا۔ اس لئے کہ میری زندگی میں اب کچھ نہیں رہا۔

ڈاکٹر۔ یہی تو تیری بھول ہے تارا۔ تیری زندگی میں سب کچھ تھا، اور سب کچھ ہے۔ اگر کچھ نہیں تھا، اور نہیں ہے، تو بس زندگی بتانے کی خواہش۔

تارا۔ لیکن بملا۔ اب اگر یہ خواہش ہو بھی، تو کیا ہو سکتا ہے۔ میرا مول کیا رہ گیا ہے؟ مَیں تو مٹی کا اترا ہُوا برتن بن کر رہ گئی ہوں۔

ڈاکٹر۔ تُو اپنے کو یہی سمجھتی ہے؟ اپنا مول یہی لگاتی ہے؟

تارا۔ ہاں بملا۔

ڈاکٹر۔ تو ایک کام کر۔ تارا، مٹی کا یہ اترا ہوا برتن مجھے دے دے۔

تارا۔ تمہیں؟

ڈاکٹر۔ ہاں، تارا اگر تیرا اتنا ہی مول ہے، تو اپنے کو مجھے دے دے۔ پھر میں
دکھاتی ہوں، کہ میں تجھے کیا بناتی ہوں۔ تارا عام عورتوں کی طرح تو نے کبھی
اپنی قدر نہ جانی۔ میں تجھ سے ایک بات پوچھتی ہوں۔ تو نے جو اتنی محنت
کی، اتنا اپمان اور آتما کا ہنن سہا ——— کس لئے سہا؟ صرف
دو روٹی اور تن ڈھانپنے کا کپڑا پانے کے لئے نا؟ لیکن ذرا یہ سوچ کر کہ اگر
تو یہ سب کچھ نہ کرتی۔ ماں، باپ، پتی سب کو ٹھوکر مار کر اپنی دنیا آپ بسانے
چل دیتی، تو کیا مزدوری کر کے، سلائی کر کے، اسکول میں پڑھا کر، اتنی روٹی
اتنا کپڑا نہ حاصل کر سکتی تھی؟ تو سکا دیکھ پھر ان روٹیوں کے لئے جتنی بھاری
قیمت تو نے ادا کی، اتنی قیمت میں تو تجھے ایک پورا جہان مل جاتا۔

تارا۔ (جیسے روشنی دیکھی ہو) بملا۔

ڈاکٹر۔ ہاں تارا۔ میں کبھی کبھی سوچتی ہوں، ہماری زندگیوں میں ہوتا کیا ہے؟
جیسے کھونے کے ڈر سے ہم گائے کی طرح بک جاتی ہیں۔ اور غلاموں کی طرح
گالیاں اور جوتیاں کھاتی ہیں۔ تو ماں باپ سے ڈری۔ دھرم اور کُل کی مریادا
سے ڈری۔ لیکن ڈر کر بھی تو نے کیا پایا؟ بوڑھے جاہل شوہر۔ سوکھے
ٹکڑے اور آتما کو کچوکے لگانے والے بول۔ کمبخت، اگر زندگی میں یہی
پانا تھا، تو اسے ٹھکرا کیوں نہ دیا۔

تارا۔ (جیسے آنکھیں کھلنے لگی ہیں) بملا، تو یہ کیا کہہ رہی ہے؟ چیزوں کو کیسے
میری سامنے رکھ رہی ہے؟ میں نے تو چیزوں کو ایسے کبھی نہ دیکھا۔

ڈاکٹر۔ اسی لئے تو نے اتنے مہنگے سودے کئے، اور آج تک لٹتی رہی۔ لیکن ابھی
وقت ہے، اب اس سودے کو ختم کر دے۔

بملا۔ (چونک کر) ڈاکٹر؟

ڈاکٹر۔ ہاں، اپنے آدمی کو چھوڑ دے، اور زندگی میں کچھ کر۔ دیکھ میں چار سو کماتی ہوں، میری شادی نہیں ہوئی۔ نوکری کے کنٹریکٹ کے مطابق میں چار سال تک شادی نہیں کر سکتی۔ تو میرے ساتھ رہ۔ تیرا بچہ میرے ساتھ رہے گا۔ میں تجھے نرسنگ کا کورس دلوا دوں گی۔ جب تو وہاں سے کورس پورا کر کے نکلے گی، تجھے میری یا کسی کی ضرورت نہ ہو گی، تو اپنے پیروں پر آپ کھڑی ہو گی۔

تارا۔ بھلا۔ کیا ..... کیا یہ سب کچھ ہو سکتا ہے؟ کیا میں اب بھی اپنی زندگی ...

ڈاکٹر۔ ہاں، تو اب بھی زندگی بنا سکتی ہے۔ اگر تو چاہے۔

تارا۔ (یکا یک گہرے لہجہ میں) لیکن وہ میرا آدمی، وہ مجھے نہ چھوڑے گا۔

ڈاکٹر۔ اسے چھوڑنا ہو گا، میں تجھے اس سے طلاق دلوا دوں گی۔

تارا۔ (کانپ کر) طلاق؟

ڈاکٹر۔ ہاں تارا۔ بے رحمی اور ظلم کرنے کی بنا پر عدالت یہ شادی منسوخ کر سکتی ہے۔ میں تیری طرف سے مقدمہ لڑوں گی۔

تارا۔ لیکن طلاق؟

ڈاکٹر۔ اس لفظ سے نہ چونک تارا۔ مرد اسے عورت کے لئے گالی کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ لیکن جب تو نے اور گالیاں کھائی ہیں، تو اس آخری گالی سے کیوں ڈرتی ہے، جو تیرے لئے گالی نہیں، مان اور ادھیکار کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔

(آرک لیمپ کی روشنی بجھ جاتی ہے۔
اور اسٹیج پر پھر روشنی ہو جاتی ہے)

تارا۔ اور میں نے یہ آخری گالی کھا کر اپنے پتی، اپنے ماں باپ، بھائی بھاوج،

سب سے اپنا حساب بے باق کر لیا۔ اچھی ہوتے ہی مَیں نے عدالت میں طلاق کی عرضی دے دی۔ بملا نے مجھے ڈاکٹری سرٹیفکیٹ دیا۔ عدالت نے جانچ کے بعد میرا طلاق منظور کر دیا۔ مَیں آزاد ہو گئی، اور اپنے بچے کو لے کر یہاں بملا کے پاس آگئی۔ یہاں اب مجھے دو سال ہو گئے ہیں۔ میرا بچہ اب پانچ سال کا ہے، اور ٹریننگ کا کورس پورا کرنے میں صرف ایک سال رہ گیا ہے۔

نریش۔ یہ ہے تمہاری کہانی؟

تارا۔ ہاں یہی میری کہانی ہے۔

نریش۔ مَیں نے تمہاری کہانی سُن لی ہے تارا۔ تم نے کہا تھا۔ کہانی سُن کر مَیں ایک منٹ بھی یہاں نہ ٹھہر سکوں گا، چلا جاؤں گا۔ لیکن مَیں گیا نہیں ہوں۔ اور ایک بار پھر اپنی چاہ دُہراتا ہُوں۔ مجھ سے شادی کر لو تارا۔

تارا۔ (چونک کر اور بڑے جذبہ سے) نریش، اتنا کچھ سُن کر، اتنا کچھ جان کر بھی؟

نریش۔ ہاں تارا۔ تمہیں یاد ہے، مَیں نے کہا تھا۔ سہنے کے لئے بڑے دِل کی نہیں بڑے دماغ کی ضرورت ہوتی ہے۔ مَیں اب بھی کہتا ہوں کہ میرا دماغ بڑا نہیں ہے۔ لیکن مَیں نے دماغ میں خیالات کے چھوٹے خانوں کو توڑنے کی کوشش ہمیشہ کی ہے ایک کنواری عورت سے، ایک بن بچے والی عورت سے شادی کرنے کی خواہش بھی خیال کا ایک چھوٹا خانہ ہے، جو دماغ میں اس لئے بن گیا ہے، کہ ہمارے سماج میں عورتیں اتنی زیادہ ہیں، اتنی بے بس ہیں، کہ آدمی ایک کنواری عورت حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن مَیں خیال کے اس چھوٹے خانہ کو بھی توڑنا چاہتا ہوں۔ (جذباتی التجا کے لہجہ میں) اس کام میں میری مدد کرو تارا۔

تارا۔ (خوف سے لرز کر) نہیں۔نہیں نرلیش۔ تم اس خانہ کو توڑ تو دو گے، لیکن آگے چل کر خوش نہ رہ سکو گے۔ بیوہ اور اس پر نیچے والی بیوی کے ساتھ کوئی خوش نہیں رہ سکتا۔

نرلیش۔ یہ بالکل جھوٹ ہے تارا۔ کیا آدمی شادی شدہ عورتوں سے، نیچے والی عورتوں سے عشق نہیں کرتے؟

تارا۔ کرتے ہیں، مگر وہ دوسری بات ہوتی ہے، وہ شادی کی غرض سے نہیں بلکہ دل بہلانے کے لئے ایسا کرتے ہیں۔

نرلیش۔ تارا، دل بہلانے اور شادی کرنے میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر فرق ہے، تو بس نیت کا فرق ہے۔ نیت نیک ہوتی ہے، تو محبت شادی میں بدل جاتی ہے، ورنہ شادی بھی ایک مذاق بن کر رہ جاتی ہے۔

تارا۔ یہ تو سچ ہے۔لیکن.......

نرلیش۔ اگر یہ سچ ہے تو جھوٹ کچھ بھی نہیں ہے تارا۔ میرے اُوپر یقین کرو۔ جو کام میں کرنے جا رہا ہوں، وہ میرے سنسکاروں کے خلاف ہے، لیکن یہ نہ بھولو کہ انسان کی زندگی کا سب سے روشن پہلو یہی ہے کہ وہ اندھیرے کا انش ہوتے ہوئے بھی اُجالے کی تلاش کرتا ہے۔ سنسکاروں کا بنا ہونے پر بھی سنسکاروں کی جڑ میں دماغ کا ہل چلا کر خیال کے نئے بیج بوتا ہے۔ مجھے خیال کے بیج بونے دو تارا۔

تارا۔ نرلیش (رو پڑتی ہے)

نرلیش۔ رو مت تارا۔ کیونکہ تمہاری زندگی کی رات بیت گئی ہے اور صبح کے اُجیارے کا سواگت آنسوؤں سے نہیں کیا جاتا۔

اِنسان

(ایک تمثیل)

(ایک صاف ہَوادار اَور روشن کمرہ جس کی دیواروں پر نیچے سفید ٹائل اور اُوپر سفید روغن کیا ہُوا ہے۔ فرش شیشے کی طرح صاف ہے۔ ایک طرف لوہے کا ایک پلنگ بچھا ہے۔ اس پر سفید روغن کیا ہُوا ہے اور اسپتالوں کے ڈھنگ سے بستر کیا ہُوا ہے۔ پاس ہی سفید رنگ کی ٹرالی میز رکھی ہے۔ بائیں طرف آکسیجن سلنڈر لگا ہُوا ہے، جس سے آنے والی ربڑ کی نلی بستر پہ پڑی۔ داہنی طرف ایک گدے دار کرسی ہے۔ جس کے آگے ایک میز ہے، جس پہ ایک ٹیبل لیمپ، کچھ کتابیں، کاغذ، قلم اَور پانی کا ایک گلاس گتے کے ایک ٹکڑے سے ڈھکا ہُوا رکھا ہے۔ بستر پر ڈاکٹر لیٹا ہُوا ہے۔ لیٹا ہُوا کہنا شاید غلط ہوگا، کیونکہ پلنگ کا سرہانا اِتنا اُونچا کیا ہُوا ہے کہ ڈاکٹر پیٹھ ٹکائے ہُوئے بیٹھا سا نظر آتا ہے۔ اس کا دھڑ تک کا حصّہ سفید چادر سے ڈھکا ہُوا ہے ——— صرف چہرہ کا سُرخ سفید رنگ نظر آتا ہے۔ قریب ہی نرس کھڑی ہے۔)

ڈاکٹر۔ نرس۔

نرس۔ (آگے بڑھ کر) یس ڈاکٹر۔

ڈاکٹر۔ اب تم جا سکتی ہو۔

نرس۔ لیکن کیوں ڈاکٹر؟

ڈاکٹر۔ (گہرا سانس لے کر) اس لئے کہ اب مجھ کو بھی جانا ہے۔

نرس۔ نہیں ڈاکٹر نہیں۔ آپ ایسے نہ سوچئے۔ مَیں سرجن صاحب کو فون کرتی ہوں۔

ڈاکٹر۔ کسی کو فون کرنے کی ضرورت نہیں نرس۔ مَیں جانتا ہوں، اب کچھ نہیں کیا جا سکتا۔

نرس۔ نہیں نہیں ڈاکٹر۔ سرجن صاحب ضرور کچھ ....

ڈاکٹر۔ وہ کچھ نہیں کر سکتے نرس۔ ایک انسان کے لئے جو کچھ بھی کیا جا سکتا ہے، میرے لئے کیا جا چکا ہے۔ ڈاکٹر لوگ اپنی نئی سے نئی دوائیں استعمال کر چکے ہیں۔ سرجن اپنے ہاتھ کے آخری کمال دکھا چکے ہیں۔ اب مَیں نہ بچ سکوں گا ـــــ مجھے جانا ہوگا۔

نرس۔ (تقریباً سسکتے ہوئے) اوہ ڈاکٹر۔ ہم کس قدر مجبور و لاچار ہیں؟

ڈاکٹر۔ (حیرت سے نرس کی طرف دیکھتے ہوئے) مجبور و لاچار؟ تم اسے انسان کی مجبوری اور لاچاری کہتی ہو نرس؟ شکر کرو کہ ہمیں موت کی نعمت نصیب ہے۔ ورنہ یقین مانو، یہ زندگی وبالِ دوش بن جاتی۔ اور یہ دنیا صدیوں بیماروں، بوڑھوں اور اپاہجوں کا ایک گھناؤنا بلغمی گھروندا۔ اس دنیا میں جو کچھ خوبصورتی، رنگینی، تازگی اور جوانی دیکھتی ہو، وہ اسی موت کے دم سے ہے۔

نرس۔ لیکن جوانی کی موت ..... آپ کے جیسی بے وقت کی موت۔ ڈاکٹر .....

(پھر سسک اُٹھتی ہے)

ڈاکٹر۔ کوئی موت بے وقت نہیں ہوتی، اور کوئی جوانی میں نہیں مرتا نرس۔ جب جسم جس وقت زندہ رہنے کی، حرکت کرنے کی، بیماری کے جراثیموں کا مقابلہ کرنے کی طاقت کھو بیٹھتا ہے، فنا ہو جاتا ہے۔ اس لئے ہر انسان عین اُس وقت مرتا ہے، جب اُسے مرنا چاہیئے۔

نرس۔ اوہ ڈاکٹر، تم کس قدر سنگ دل ہو۔

ڈاکٹر۔ اور شکر کرتا ہوں کہ میں سنگ دل ہوں۔ روتا مُنہ لبسورتا اور ماتم کرتا ہوا وہ اِنسان نہیں ہوں، جو آنکھوں کی روشنی کو روکر زائل کرتا ہے۔ اور گالوں کی سرخی کو آنسوؤں کے کھار سے کاٹ کر زردی میں تبدیل کرتا ہے۔ میں ڈاکٹر ہوں۔ میرا کام زندگی کی حفاظت سے رہا ہے۔ موت کا ماتم کرنے سے نہیں۔ (یکایک تھکان محسوس کرتے ہوئے) لیکن اب میں یہ بحث نہ کرسکونگا۔ اِس لئے جاؤ، اور آرام کرو۔

نرس۔ (اصرار سے) نہیں ڈاکٹر۔ اِس وقت میں آپ کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔ میں یہیں رہوں گی۔

ڈاکٹر۔ (تھکے ہوئے مگر یقینی لہجہ میں) نرس تم ہمیشہ میرے بُلانے پہ آئی ہو، اور میرے کہنے پہ چلی گئی ہو۔ آج بھی ایسا ہی کرو ——— جاؤ۔

نرس۔ لیکن......

ڈاکٹر۔ (قطعیت کے لہجہ میں) الوداع نرس۔

نرس۔ خدا حافظ ڈاکٹر۔

(نرس چلی جاتی ہے۔ سازوں کی ایک غمناک موسیقی اُبھرتی ہے اور جب یہ موسیقی مدھم پڑنے لگتی ہے تو ڈاکٹر کی آواز سُنائی دیتی ہے)

ڈاکٹر۔ اب انتشار کا لمحہ آگیا۔ اب تک جو دیکھ سکتا تھا، سُن سکتا تھا، بول سکتا تھا، عمل کر سکتا تھا ـــــ اب ختم ہُوا چاہتا ہے۔ آنکھوں کی روشنی کے دیئے بجھنے لگے۔ ماند جیرے کھودے سے کے مسموم بادل، میرے اوپر نیچے، دائیں بائیں سر ٹوٹ ٹوٹ کر مجھ پر گرنے لگے۔ دھرتی جیسے میرے جسم کو چھوڑ کر یکایک نیچے، بہت نیچے چلی گئی ہے۔ اور مَیں فنا کے خلا میں اُس چنگاری کی طرح اکیلا ٹنگا رہ گیا ہوں۔ جسے کوئی تیز رفتار گاڑی رات کے سیاہ سناٹوں میں چھوڑ کر آگے چلی جائے۔ راکھ کے مہین ذرّوں میں مبتدل ہونے کے آخری عمل سے گُزرنے کے لیئے۔ (گہرا سانس لے کر) اب مَیں بھی راکھ کے مہین ذرّوں میں تبدیل ہونے کے آخری عمل سے گُزرا چاہتا ہوں۔ لیکن.... لیکن کاش۔ مَیں ابھی کچھ دن اور جی سکتا۔

(یکایک فضا میں کسی کا سخت، سفاک اور پُر طنز قہقہہ گُونج اُٹھتا ہے، اور وقت ڈاکٹر کے سراہنے کھڑا ہوتا ہے۔)

وقت۔ ہا.... ہا.... ہا.... تو ابھی تُو مرنا نہیں چاہتا، کچھ دن اور جینا چاہتا ہے، ہا ہا ہا۔ آخر راہِ راست پر آیا، مجھ سے پناہ مانگی۔

ڈاکٹر۔ (اس کی طرف دیکھتے ہوئے) تُو.... تو کون ہے؟

وقت۔ مَیں؟ مَیں کون ہوں۔ ہا ہا ہا۔ تُو نے مجھے نہیں پہچانا، لیکن ہاں، آج تو مجھے کیسے پہچان سکتا ہے۔ آج تیری آنکھوں کی وُہ بینائی کہاں ہے، جس کے دم پر تُو ستاروں کی دُنیا میں جھانکنے کے دعوے کرتا تھا۔ تیری اِن دُوربین اور خُردبین کا دکھاوا کہاں ہے، جن کے زعم میں تُو کائنات کے راز پڑھنا چاہتا تھا۔ ختم ہو گیا؟.... لیکن تُو سُن تو سکتا ہے، تو لے اپنے کانوں سے سُن؛

اور میری آواز سے مجھے پہچان۔

(ایک ساتھ بہت سی گھڑیوں کی ٹِک ٹِک

اور ٹن ٹن کا شور سُنائی دیتا ہے۔)

ڈاکٹر۔ (پریشان ہو کر) اوہ یہ کیا شور ہے، کیا طوفانِ بدتمیزی ہے۔ بند کرو اِسے۔

وقت۔ ہاہاہا.... (شور بند ہو جاتا ہے) لے بند کر دیا۔ اب پہچانا مجھے؟

ڈاکٹر۔ ہاں۔ تُو وقت ہے۔

وقت۔ ہاں، وقت۔ کائینات کی گردش کا ناظم۔ زندگی کی مُدت کا حاکم اعلیٰ۔

ڈاکٹر۔ لیکن اس حاکمِ اعلیٰ کے پاس تو رُکنے کی فرصت نہیں ہوتی۔ کسی کی بات سُننے کی مہلت نہیں ہوتی جس کے مزاج میں پارے کا تلاوہ ہے، وہ آج کیسے قرار پاگیا؟ میرے پاس کیسے ٹھہر گیا؟

وقت۔ (غرور سے) تیری آواز پر۔

ڈاکٹر۔ (حیرت سے) میری آواز پر؟

وقت۔ ہاں، آج جب زندگی تجھے موت کے بیابان میں چھوڑ گئی ہے۔ آج جب تیری یہ حسین وجمیل دُنیا تجھ سے کنارہ کش ہو گئی ہے۔ آج جب تیرے نگہبان، چارہ گر، چارہ ساز، مجبور و مایوس لوٹ گئے، تو پہلی مرتبہ تجھے معلوم ہُوا ہے تو کس قدر مجبور و لاچار ہے۔ تو مکمل بے بسی کے عالم میں تڑپ اُٹھا۔ کاش میں کچھ دن اور جی سکتا۔ میں تیری اس مجبور آواز کو سُن کر ہی تیرے پاس آیا ہوں۔ بول تو اپنی زندگی میں کتنے ماہ و سال کی توسیع چاہتا ہے!

ڈاکٹر۔ (حیرت سے) توسیع؟

وقت۔ ہاں۔ قدرت نے زندگی کے ڈور میرے ہاتھوں میں دی ہے۔ سانس

کے تانے میرے سپرد کیے ہیں۔ میرے کارخانے میں ان گنت چرخیوں پہ
ماہ و سال و صدیاں لپٹے پڑے ہیں۔ میں جس کی زندگی کا تانا لمبا کرنا چاہوں
لمبا کرتا چلا جاؤں جس کی زندگی کا پتنگ کاٹنا چاہوں۔ اس کی ڈور گٹک
کر کٹ سے توڑ دوں۔ میں ان دھاگوں اور تانوں کا مالک ہوں۔ میں تیری
عمر کو توسیع بخش سکتا ہوں۔

ڈاکٹر۔ لیکن مجھ پہ یہ نوازش کیسی؟ یہ کرم کیونکر؟ تو تو دعوے کرتا ہے کہ تو کسی کی
کمان سے چھوٹا ہوا وہ سفاک تیر ہے۔ جو ازل سے ابد تک جانداروں
کے سینے میں شگاف ڈالتا رہے گا۔ وہ منہ زور بے لگام گھوڑا ہے، جو دنیا
کے سبزہ زار کو اپنی جلاد ٹاپوں سے پامال کرتا رہے گا۔ وہ طوفان ہے جو
ہستی کی وادی میں موت کے ستم ڈھاتا رہے گا۔ پھر آج تیرے سینہ میں یہ
درد کیسا؟ رحم کی یہ تحریک کیسی؟

وقت۔ اس لئے کہ آج میں نے تجھے، ایک خود پرست، خودسر انسان کو اپنے سامنے
گھٹنے ٹیکے پایا ہے۔ حسرت کا کشکول لئے اپنے در پہ دستک دیتے دیکھا ہے۔

ڈاکٹر۔ بہت خوب۔ تو میرے اس بول پہ کہ کاش میں کچھ دن اور جی سکتا، تیرے
دل کی کلی یوں کھل اٹھی؟ تو میری ہستی اور اپنی اصلیت کو بھول کر مجھ
پہ یوں حاوی ہونے چلا آیا؟ لیکن کم عقل، نادان، ناسمجھ، حماقت کی اس
مہم پہ روانہ ہونے سے پہلے تو نے یہ تو سوچا ہوتا کہ تو ہے کیا؟

وقت۔ (غصے سے) کیا؟ کیا کہا؟ میں ہوں کیا؟

ڈاکٹر۔ ہاں میرے نادان دوست، ذرا سوچ کہ تیری ہستی کیا ہے، تو مادہ نہیں تو
گیس نہیں، تو جاندار نہیں، تو بے جان نہیں۔ تیری بو نہیں۔ تیرا رنگ نہیں،
تیری پہچان بھی ہوتی ہے، تو ستاروں کی گردش سے بنا میری بنائی ہوئی ادنیٰ

سی گھڑی کی سوئیوں سے۔

وقت۔ لیکن اس سے کیا ہوا؟ اُلٹا تو یہ سوچ کہ اتنا کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی میں کتنا کچھ ہوں۔ میرا جسم نہیں، میری رُوح نہیں، میرا رُوپ نہیں، میرا رنگ نہیں۔ لیکن پھر بھی میرے اندر ہستی کی وہ تمام خوبیاں موجود ہیں، جو کسی جاندار میں ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر۔ مثلاً؟

وقت۔ مثلاً میں چلتا ہوں، گزرتا ہوں، میری اپنی رفتار ہے۔

ڈاکٹر۔ بہت خوب۔ تیری غلط فہمی لاعلمی کی حدوں سے جا ملی ہے۔

وقت۔ (غصّے سے بپھرتے ہوئے) کیا کہا؟

ڈاکٹر۔ یہی کہ تم تو غلط فہمی میں نہیں، مکمل لاعلمی میں گرفتار ہے۔ اگر تو سمجھتا ہے کہ تیری اپنی رفتار ہے۔ ارے احمق، جسے تو اپنی رفتار کہتا ہے، وہ دراصل تیری نہیں، میرے دماغ کی حالت کا عکس ہے۔ میرے جذبات کی روشنی کی پرچھائی ہے۔

وقت۔ تیرا دماغ تو نہیں چل گیا؟

ڈاکٹر۔ نہیں میرے دوست، وہ اس گھڑی بھی ٹھیک اُسی طرح کام کر رہا ہے جس طرح اب تک کرتا آیا ہے۔ ذرا سوچ کہ جب مجھے کسی کا انتظار ہوتا ہے تو ایک پل کس طرح ایک صدی کی طرح سُست گزرتا ہے۔ لیکن جب وہ آجاتا ہے جس کا انتظار ہوتا ہے تو کس طرح دن، مہینے اور سال ایسے پلک جھپکنے میں بیت جاتے ہیں، جب چند گھڑیاں، کبھی زندگی کے سَو سال چھوٹے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن کبھی زندگی کا ایک لمحہ پوری زندگی پر بھاری گزرتا ہے۔ اگر تیری رفتار تیری اپنی رفتار ہے تو پھر وہ میرے دل و دماغ کی حالت کے سانچے میں

ڈھل کر کم و بیش کیوں ہو جاتی ہے؟ اپنی انفرادیت اور آزادی کیوں برقرار نہیں رکھ پاتی؟

وقت۔ (بوکھلا کر) نہیں نہیں۔ یہ حقیقت نہیں ہے، شاعری ہے۔ تخیل پرستوں کی غلط فہمی پیدا کرنے والی رومانی تفسیر ہے۔

ڈاکٹر۔ (پُر زور لہجہ میں) غلط۔ یہ شاعروں کی رومانی تفسیر نہیں ہے۔ یہ ایک فلسفیانہ حقیقت ہے۔ سیاروں اور ستاروں، پتھروں اور پہاڑوں کی طرح تیری تخلیق قدرت نے نہیں کی۔ تو قدرت کے کارخانہ سے ڈھل نہیں نکلا۔ تیرا تصور میں نے کیا۔ کائنات کی گردش کو ماپنے، مادہ کے بدلتے ہوئے رویوں کو پرکھنے اور اپنے وجود کی ارتقائی صفت کو ظاہر کرنے کے لئے مجھے ایک پیمانہ کی ضرورت تھی۔ میں نے ماضی، حال، مستقبل اور ماہ و سال و صدیاں کے نشانات لگا کر اس خیالی پیمانہ کو مرتب کیا، جو تو ہے۔

وقت۔ (مکمل بوکھلاہٹ کے عالم میں) نہیں نہیں۔ یہ فلسفیانہ ذہنیت کا منفی ساختشانہ ہے۔ سائینس کے کفرانہ دور کا شیطانی پاکھنڈ ہے۔ میں ہمیشہ سے ہوں اور ہمیشہ تک رہوں گا۔

ڈاکٹر۔ ہاں، یہ مجھے بھی تسلیم ہے۔ لیکن اس لئے نہیں کہ تیرا اپنا کوئی ٹھوس وجود ہے، بلکہ محض اس بنا پر کہ جو طاقت تیرے تصور کو جنم دیتی ہے، وہ اس دنیا سے کبھی ناپید نہ ہوگی۔ اور وہ ہے انسان کی عقل، اس کا ذہن، اس کا تخیل جب تک کائنات کے کسی بھی گوشہ میں ایک انسان باقی رہے گا، اور ہوش و حواس کی دولت سے مالا مال رہے گا، وہ تیرے تصور کو جنم دیتا رہے گا۔ لیکن پرچھائی کی طرح تو اپنا الگ، آزاد اور ٹھوس وجود کبھی ثابت نہ کر سکے گا کیونکہ در اصل تو کچھ نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔

وقت ۔ (سراسیمہ ہوکر) نہیں نہیں۔ یہ تیرے دلائل اور تیرے سائنٹیفک شعور کی ایک بھیانک سازش ہے۔ یہ تیری منطقی ذہنیت کا خطرناک طلسم ہے۔ میں اپنے اُوپر اس طلسم کو نہیں چلنے دوں گا۔ میں جاتا ہوں، ابھی وقت جاتا ہوں۔

(وقت چلا جاتا ہے، موسیقی کی ایک لہر اُبھرتی ہے۔ اسٹیج خالی ہو جاتا ہے اور نیم تاریکی میں پھر ڈاکٹر کی آواز اُبھرتی ہے۔)

ڈاکٹر ۔ اب روشنی گُل ہوا چاہتی ہے۔ سانس کی لے دم توڑا چاہتی ہے۔ اور میری یہ حسین جمیل رنگین دُنیا مجھ سے جُدا ہوتی ہے۔

(ایک بھاری، ٹھہری ہوئی بزرگانہ آواز سُنائی دیتی ہے۔)

مذہب ۔ ہاں بیٹا، تیری یہ دُنیا اب تجھ سے جُدا ہوتی ہے۔ تیرے عزیز، اقارب، دوست احباب، اب تجھ سے دُور ہوتے ہیں۔ فانی چیزوں سے تیرا رشتہ ٹوٹتا ہے، اور لافانی چیزوں سے تیرا ناطہ جُڑتا ہے۔

ڈاکٹر ۔ (اُکتاہٹ سے) اس بار کون آیا؟

مذہب ۔ تم نے نہیں پہچانا؟

ڈاکٹر ۔ نہیں، کیونکہ اب میں دیکھ نہیں سکتا۔ لیکن آواز کی سنجیدگی، لہجہ کی بزرگانہ نرمی سے اندازہ لگاتا ہوں کہ آپ کوئی بزرگ درویش سفید ریش ہیں۔ براہِ کرم مجھے اپنے تعارف سے سرفراز کیجئے۔

مذہب ۔ بیٹا، میں وہ ہوں جو پیدائش سے تمہارے ساتھ ہوتا ہوں اور موت تک تمہارے ساتھ جاتا ہوں۔ میں وہ ہوں جو تمہاری آگہی کے لئے تمہارے

ساتھ ہوتا ہوں۔ لیکن جس کی آواز تم سُنی اَن سُنی کرتے چلے جاتے ہو میں
وہ ہوں جو تمہیں تمہارے وجود کی اصلیت سے تمہاری دُنیا کے طلسم سے
تمہارے انجام کے المیہ سے باخبر کرتا ہوں۔

ڈاکٹر۔ (قدرے پریشان ہوکر) لیکن بزرگ درویش، میرے پاس وقت کم ہے۔ میں
اس گھڑی بات کو بے بات لمبا کرنے کی اس عادت کو برداشت نہیں کرسکتا،
جو بڑھاپے میں اکثر پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لئے اگر ممکن ہوسکے تو مختصر الفاظ
میں فرمایئے، آپ کون ہیں؟

مذہب۔ تو بے تاب ہو اٹھا؟ میں جانتا ہوں تو میری نصیحت اور میرے واعظ
سے دُور بھاگتا ہے۔ میرے لئے تیرے پاس وقت نہیں ہوتا۔ لیکن میں
تجھے نہیں چھوڑ سکتا، کیونکہ خدا نے مجھے تیری رُوح کی حفاظت اور تیرے
گنہگار وجود کی مکتی کے لئے بھیجا ہے۔

ڈاکٹر۔ (بیزاری سے) اوہ، تم مذہب ہو۔

مذہب۔ ہاں بیٹا۔ تم لوگ مجھے اِسی نام سے پکارتے ہو۔

ڈاکٹر۔ لیکن تمہیں معلوم ہے۔ میں زندگی بھر تمہیں نظرانداز کرتا اور بے معنی سمجھتا
آیا ہوں۔ پھر اس وقت آنے کی ضرورت؟

مذہب۔ ضرورت تجھے نہیں، مجھے ہے بیٹا، کیونکہ میں تیری رُوح کا امانت دار ہوں۔
مجھے تیری رُوح کو گناہوں سے پاک کرکے، دُنیا کی مادی خواہشوں سے صاف
کرکے، اُس خدا کے حضور میں پیش کرنا ہے، جو رُوحوں کا منبع ہے۔

ڈاکٹر۔ یہ میں نے سُن رکھا ہے۔ لیکن جب میں نے تمہاری معرفت نجات پانے سے
بارہا انکار کیا ہے تو اس وقت آپ کے آنے کی ضرورت کیا تھی؟

مذہب۔ بیٹا، میں اِس لیے آیا ہوں، کہ کم از کم اس آخری وقت میں تو مجھ پر ایمان

لے آئے۔ اور اس بات کا موقعہ دے کہ مَیں خدا سے تیرے گناہ معاف کرا سکوں۔

ڈاکٹر۔ لیکن تمہیں معلوم ہے کہ نہ مَیں تم پر ایمان رکھتا ہوں اور نہ تمہارے خدا پر۔

مذہب۔ مجھے معلوم ہے۔ جوانی کے نشے میں اور اینٹ، پتھر اور دھات کی کاریگری کے زعم میں تُو نے اپنے آپ کو سب سے عظیم سمجھا ہے۔ تُو نے مجھے کچھ نہ سمجھا خدا کے وجود کو نہ گردانا۔ قدرت کے قلعے پر کمند پھینکی اور مادّہ کو غلام بنا کر اپنے کو کائنات کا حاکم و مالک سمجھ بیٹھا۔ لیکن آج جب تُو مر رہا ہے، تیرا علم اور تیری ایجادیں تجھے بچانے سے معذور ہیں، تب تُو نے محسوس کیا ہوگا کہ کوئی تجھ سے بھی بڑا، عظیم تر ہے۔

ڈاکٹر۔ (طنز سے) اور وہ عظیم تر، تمہارا خُدا ہے۔

مذہب۔ (طنز نہ سمجھتے ہوئے) ہاں، وہ عظیم تر ہی نہیں، وہ عظیم ترین ہے۔ وہ نیکی کا سُورج ہے، سچائی کا نُور ہے، زندگی کا خالق ہے۔ دُنیا میں جو حرارت اور حرارت ہے، حرکت اور ہلچل ہے اُسی کے دم سے ہے۔

ڈاکٹر۔ (تمسخر آمیز مسکراہٹ کے ساتھ) خالصہ شاعرانہ خیال ہے۔

مذہب۔ یہ خیال نہیں، حقیقت ہے۔ پہلی اور آخری۔

ڈاکٹر۔ مگر میرے خیال میں تو یہ انسان کی سب سے پہلی شاعری ہے، جسے بدنصیبی سے دُنیا آخری حقیقت اور سچائی سمجھ بیٹھی ہے۔

مذہب۔ (غصّے سے) تو تو خدا کے وجود سے انکار کرتا ہے؟ اس کی ہستی ہی نہیں مانتا؟

ڈاکٹر۔ جو چیز موجود نہیں، جس کے موجود ہونے کا کوئی معقول ثبوت نہیں —— اُس کے وجود سے اقرار کرنا یا اُس کی ہستی کے ماننے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے؟

مذہب۔ بدنصیب، بدبخت انسان۔ تجھے آج تک اس کی موجودگی کا کوئی ثبوت نہ ملا؟

ڈاکٹر۔ کوئی آخری ثبوت نہیں۔

مذہب۔ تو تو کیا ہے؟

ڈاکٹر۔ انسان۔

مذہب۔ تجھے کس نے پیدا کیا؟

ڈاکٹر۔ ایک جسمانی عمل نے۔

مذہب۔ اور اس جسمانی عمل کو؟

ڈاکٹر۔ مادہ کے عناصر نے، ان کی برسرِ عمل ترکیب نے، جو نئے نئے تناسب سے نئی نئی شکلوں کو جنم دیتی ہے۔

مذہب۔ اور اس مادہ کو کس نے جنم دیا؟

ڈاکٹر۔ (معنی خیز انداز میں) اس کا جواب ضروری ہے؟

مذہب۔ (غالب آکر) ضروری ہی نہیں، بلکہ ناگزیر ہے، کیونکہ اس کے جواب میں تیری سرکشی اور تیری ہٹ دھرمی کا توڑ ہے۔

ڈاکٹر۔ تو پھر اس کا جواب پہلے تم دو۔ میں بعد میں دوں گا۔

مذہب۔ تو سُن گمراہ نادان۔ مادہ کو خدا نے جنم دیا۔

ڈاکٹر۔ (بڑے منطقی جوش سے) اور خدا کو کس نے جنم دیا؟

مذہب۔ کسی نے نہیں۔ خدا کو کون جنم دے سکتا ہے۔ وہ تو ہمیشہ سے تھا۔

ڈاکٹر۔ تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ ضروری نہیں کہ ہر چیز کا پیدا کرنے والا کوئی ہو؟ وہ پیدا کئے بغیر بھی ہمیشہ سے ہو سکتی ہے؟

مذہب۔ ہاں۔

ڈاکٹر۔ تو پھر میرا جواب بھی سُن لو میں کہتا ہوں کہ مادے کو بھی کسی نے جنم نہیں دیا۔ تمہارے

خدا کی طرح وہ بھی ہمیشہ سے تھا۔

مذہب۔ لیکن کس طرح سے تھا؟

ڈاکٹر۔ جس طرح سے تم کہتے ہو، تمہارا خدا ہے؟

مذہب۔ لیکن یہ کوئی جواب نہیں۔

ڈاکٹر۔ تو پھر خدا کے متعلق جو جواب تم نے دیا، وہ بھی کوئی جواب نہیں۔ بزرگ بابا، اصل جواب وہ ہوتا ہے، جس سے کوئی دوسرا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن تم نے جو جواب دیا، اس سے بھی وہی سوال پیدا ہوا، جو میرے جواب سے پیدا ہوتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آج تک کوئی نہیں جانتا یہ کائنات کب اور کیونکر بنی۔ مادہ کو کس نے جنم دیا۔ اس میں حرارت اور حرکت کہاں سے آئی۔ یہ سوال ابھی بے جواب ہیں۔ لیکن تم اپنی کم علمی قبول نہیں کرتے۔ جواب دینے کی خواہ مخواہ کوشش کرتے ہو۔ تم کو احساس ہے کہ تمہارے جواب سے ذہن مطمئن نہیں ہوگا۔ زبان خاموش نہیں ہوگی۔ اس لئے تم پہلا کلام یہ کرتے ہو کہ دماغ کو اعتقاد کی افیون چٹا دیتے ہو۔ اور جب یہ بند و بست ہو جاتا ہے تو تم دھوپ اور لوبان کی خوشبوؤں میں لپٹے اور تسبیح عصا لئے بزرگانہ انداز میں آتے ہو اور عقیدت کے نشہ میں سرشار ہوئے لوگوں پر اپنی آواز کا جادو چلاتے چلے جاتے ہو۔

مذہب۔ (غصہ میں) اوہ، تو شیطان تجھ پر اس حد تک غالب آگیا؟

ڈاکٹر۔ شیطان؟ یہ شیطان کون ہے؟

مذہب۔ خدا کا دشمن، مذہب کا بیری۔

ڈاکٹر۔ لیکن تم تو کہتے ہو، خدا سب سے زیادہ طاقت ور ہے۔ اس کے نور کی آگ میں جل کر سب کچھ پاک ہو جاتا ہے۔ پھر یہ شیطان کیونکر زندہ ہے؟ تمہارے خدا کے ہوتے ہوئے مجھ پر کیسے حاوی ہو گیا؟

مذہب - اس لئے کہ تیری رُوح میں کھوٹ ہے - اس میں بدی کا عنصر ہے - اور بدی کا عنصر ہمیشہ شیطان کی طرف جھکتا ہے -

ڈاکٹر - لیکن میری رُوح میں بدی کا یہ عنصر کہاں سے آیا ؟ تم تو رُوح کو خُدا کی بیٹی بتاتے ہو - اگر یہ سچ ہے تو مجھے بتاؤ ، خُدا کی اِس بیٹی میں بدی کہاں سے آئی ؟ اِس چنگاری میں نور کے ساتھ نار کہاں سے آیا ؟ اِس سے تو محض یہی ثابت ہوتا ہے کہ خود خدا میں نیکی کے ساتھ بدی کا کھوٹ شامل ہے - روشنی کے ساتھ اندھیرے کی کالکھ شامل ہے ، یا پھر اس میں اِتنی طاقت نہیں کہ بدی کو ختم کر سکے ، اندھیرے کو دُور کر سکے ، شیطان کو ہرا سکے -

مذہب - تو یہ کیا کفر بک رہا ہے ؟

ڈاکٹر - مَیں محض تمہارے فریب میں آنے سے اِنکار کر رہا ہوں -

مذہب - (غصّہ سے بے قابو ہو کر) گستاخ ، بے اَدب - تو میرے آسمانی علم کو فریب کہتا ہے ؟

ڈاکٹر - (مصنوعی حیرت سے) آسمانی علم ؟ بوڑھے بابا معلوم ہوتا ہے ، دوسروں کو ایمان کی افیون چٹاتے چٹاتے خود بھی ایمان کی افیون چاٹ کر اپنی اصلیت بھول بیٹھے ہو - بزرگ بابا ، بہتر ہو کہ تم یاد رکھو ، تمہارا وجود آسمانی نہیں ہے -

مذہب - کیا کہا گستاخ ؟

ڈاکٹر - یہی کہ تم آسمانی چیز نہیں ہو - تم کو ایک زمینی نے جنم دیا ہے مَیں نے جنم دیا ہے -

مذہب - تیری یہ جرأت - جہنمی -

ڈاکٹر - یہ جرأت نہیں ہے ، سچائی کا اِظہار ہے - بزرگ بابا ، تم کو مَیں نے جنم دیا ہے - تم میرے ہی جیسے چند انسانوں کے دماغ کا ایک خیال ہو - اور ایک ایسا خیال جو صدیوں پہلے پیش کیا گیا ، لیکن جو آج کے حالات میں بہت حد تک فرسودہ

اور بے معنی ہو گیا ہے۔ یہ جو کچھ نُور تمہارے چہرے پر ہے، میرے ہی دماغ اور میرے ہی ایمان کی دین ہے۔ میں نے تم کو جنم دیا۔ میں نے تم کو کتابوں میں تحریر کیا اور پھر میں نے ہی تمہیں ماتھے سے لگایا ..... لیکن افسوس ہے کہ اب میں ایسا نہیں کر سکتا۔ تمہاری بوسیدہ کتابوں کے مدقوق اوراق پر عقیدت کا بوسہ نہیں دے سکتا، کیونکہ میں نے تمہارے بعد اور بہت سے مذہبوں اور خیالوں کو جنم دیا ہے اور وہ تم سے کہیں زیادہ صحیح طریقے پر میری راہیں روشن کرتے ہیں۔ اس لئے بزرگوار لوٹ جاؤ، اپنے اس تاریک حجرے میں جو میرے خیالوں کے ان گنت ایوانوں کے سب سے پچھلے حصّے میں تمہارے لئے وقف ہے اور ترک کردو اس تمنا کو، کہ میں تمہارے ہاتھوں کو بوسہ دیکر ایک بار پھر تمہاری ذہنی اطاعت قبول کروں گا۔

مذہب۔ (غصّہ اور احساس شکست سے بالکل بوکھلا کر) اوہ، تو اس حد تک گمراہ ہو گیا؟ تیری رُوح اس حد تک ملفوف ہو گئی۔ تیری نجات .....

ڈاکٹر۔ مجھے اپنی نجات کی کوئی تمنا نہیں۔ اس وقت میں صرف تم سے نجات پانا چاہتا ہوں۔ اس لئے نکل جاؤ، دُور ہو جاؤ، میری آنکھوں کے سامنے سے۔

(مذہب کانپ کر باہر نکل جاتا ہے، موسیقی کی ایک اور لہر اُبھرتی ہے اور ڈاکٹر کی تھکی ہوئی آواز ایک بار پھر سُنائی دیتی ہے۔)

ڈاکٹر۔ اوہ۔ اب جسم کے ذرّے بکھر جانا چاہتے ہیں۔ جسم دیمک کے ٹیلوں کے اوپر کی کھائی ہوئی مٹی کی طرح بے جان، بے سَت ہوا چاہتا ہے۔ اور ——— اور ہوش کی شمع بجھا چاہتی ہے۔ اس لئے الوداع ..... اے رُوپ رنگ، لمس آواز اور ذائقہ کی زہرہ جبیں دُنیا، الوداع کہ تیرا ایک شیدائی تجھ سے جُدا ہوتا

چاہتا ہے۔

(ایک بوڑھی عورت کا گھناؤنا قہقہہ اُبھرتا ہے)

موت۔ ہی.... ہی.... ہی۔ الوداع! بالآخر آگیا میری مٹھی میں پِس گیا۔ میرے پیچھے میں کتنی دیواریں، کتنی رکاوٹیں، کتنی باڑھیں لگائی تھیں میرے راستے میں۔ کتنے جتن، کتنے اہتمام کیئے تھے، مجھے روکنے کے...... لیکن آخرکار.....

ہی.... ہی.... ہی

ڈاکٹر۔ (نیم غنودگی کے لہجہ میں) کون ہے یہ بوڑھی کھوسٹ عورت، جس کے قہقہہ اُس کے وجود سے زیادہ گھناؤنے سنائی پڑ رہے ہیں۔

موت۔ مَیں؟.... ہی ہی ہی۔ مَیں بتاؤں؟

ڈاکٹر۔ ہاں۔ بتا کہ تو کس شیطان کی خالہ ہے۔

موت۔ (سخت اور بے رحم لہجہ میں) اُس شیطان کی، جو ازل سے لے کر ابد تک تیری دُنیا کو پامال کرتا رہے گا۔ جو تجھے چٹکی میں پکڑ کر اُٹھائے گا، اور مٹی کے کھلونے کی طرح توڑ توڑ کر مٹی مٹی کرتا رہے گا۔ جو عقاب کی طرح تیرے آشیانہ پر جھپٹتا رہے گا، اور تیری نسل کے جوڑوں کو تیرے پَروں تلے سے نکال کر لے جاتا رہے گا۔ مَیں اِس شیطان کی خالہ ہوں، جسے ملک الموت کہتے ہیں۔

ڈاکٹر۔ (بے پروائی سے) اوہ، تو موت ہے۔

موت۔ ہاں، اور تیری موت۔

ڈاکٹر۔ (حیرانی سے) میری؟

موت۔ ہاں تیری، اور وہ موت، جو ٹالے نہیں ٹلتی۔

ڈاکٹر۔ بہت خوب۔ یعنی بڑی بی ابھی تک پُرانی غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں۔

موت۔ کیا کہا؟

ڈاکٹر۔ یہی کہ بہتر ہو، اگر تم پُرانی غلط فہمیوں کے دھندلکوں سے نکل آؤ اور اس بیسویں صدی کی سائنس کا سامنا کرو کہ اب تم اٹل نہیں ہو۔

موت۔ مَیں اب اٹل نہیں ہوں ؟

ڈاکٹر۔ ہاں، قطعی نہیں۔ اب مَیں تمہیں روک سکتا ہوں، ٹھہرا سکتا ہوں۔ اکثر اوقات خالی ہاتھ واپس بھیج سکتا ہوں۔

موت۔ کس طرح ؟

ڈاکٹر۔ جس طرح میرے سلسلہ میں تمہارے ساتھ تین بار ہوا ہے۔ یاد ہے اس سے پہلے تم مجھ پر تین وار کر چکی ہو۔ ایک بار تم نے پلیگ بھیجی، دوسری بار تپ دق اور تیسری بار کار کا ایک حادثہ، جس کی چوٹ کے علاج کے دوران میں میرے دل کی حرکت ۲ منٹ کے لئے بند ہو گئی۔

موت۔ (اپنی خجالت کو چھپاتے ہوئے) تو ..... تو کیا ہوا ؟

ڈاکٹر۔ اس سے کچھ نہیں ہوا ؟ (طنزاً ہنستا ہے) کاش آج میری آنکھیں دیکھ سکتیں۔ تب تو اپنی اس ندامت اور خجالت کو میری آنکھوں سے نہ چھپا سکتی، جو اس وقت یقیناً تیرے بوڑھے گالوں پر سُرخی کی صورت میں پھیل چکی ہو گی۔ بڑی بی اب تم اٹل نہیں ہو۔

موت۔ یہ غلط ہے، تو اتفاق سے بچ گیا کیونکہ تیرے پاس دولت تھی، تیرے دوست ڈاکٹر تھے۔ تجھے علاج اور آپریشن کی تمام سہولتیں میسّر تھیں لیکن عام انسان ـــــــ تیرے کروڑوں بھائی .....

ڈاکٹر۔ وہ بھی اب بہت حد تک تیرے چنگل سے آزاد ہو چکے ہیں۔ بڑی بی، یہ درست ہے کہ آج سے کچھ سال پہلے تم ٹالے نہ ٹلتی تھیں۔ تمہارا ہر حملہ کارگر ہوتا تھا۔ تم وبا بھیجتی تھیں اور لاکھوں آدمی ان کی آن میں تمہارا شکار ہو کر چھوٹوں کی

طرح مرجاتے تھے۔ لیکن آج تمہارے ملیریا، پلیگ، ہیضہ، چیچک، حتّےکہ تپ دق جیسے آزمودہ اور مہلک ہتھیار بھی بہت حد تک بے کار ہو چکے ہیں۔ اب تمہاری مارنے کی طاقت بہت حد تک کم ہو گئی ہے۔

موت۔ (ملامت کے انداز میں) لیکن ختم نہیں ہوئی، تو ایک بار بچ سکتا ہے۔ دو بار بچ سکتا ہے، تین بار بچ سکتا ہے۔ لیکن آخر کار......

ڈاکٹر۔ ہاں، آخر میں ختم ہوتا ہوں، لیکن اب تیرا یہ دعوے بھی ختم ہوا کہ تیری گھڑی مقرر اور نشانہ اچوک ہے۔ آج بہت حد تک تو میرے سامنے بے بس اور بے سہارا بنی کھڑی رہتی ہے۔ میرے آئیسوٹوپ، انجیکشن، آکسیجن اور بلڈ ٹرانسفیوژن تجھے گھنٹوں نہیں، دنوں، ہفتوں اور بعض اوقات برسوں انتظار میں کھڑا رکھتے ہیں۔ تیرے آنے کے باوجود میں ابھی تین دن سے زندہ رہا ہوں۔

موت۔ لیکن اب تو اور زیادہ نہ جی سکے گا۔ میرے سوا اب تجھے کوئی نہ بچا سکے گا۔

ڈاکٹر۔ یہ ایک خوبصورت غلط فہمی ہے، بڑی بی۔ مجھے اب تم بھی نہ بچا سکو گی۔

موت۔ کیوں؟

ڈاکٹر۔ اس لئے کہ یہ تمہاری طاقت سے باہر ہے۔

موت۔ (غصہ سے بپھر کر) ہوش کی دوا کر۔ میرے پنجوں میں سسکتے ہوئے حقیر انسان میرے زہریلے سانسوں نے شاید تیرے ہوش و حواس کی لو بجھا دی۔

ڈاکٹر۔ نہیں، وہ اب بھی اُسی طرح جل رہی ہے، اور اس لئے میں اس قابل ہوں کہ تجھے تیری اصلیت سے آگاہ کر سکوں۔

موت۔ میری اصلیت سے اور تو؟

ڈاکٹر۔ ہاں، بڑی بی، اس فریضہ کو شاید میں ہی ادا کر سکتا ہوں، کیونکہ میرے علم کے مطابق ساری کائنات میں صرف میرے پاس ہی عقل کا وہ کمال ہے جو

حقیقت کی کھان کاٹ کر سچ کا سونا نکالنا ہے۔

موت۔ تو دکھا، وہ سونا۔ جو تو نے اس کھان سے نکالا ہے۔ بتا کہ میں کیا ہوں؟

ڈاکٹر۔ تم ؟ بڑی بی، تم تعمیر میں خامی کا نتیجہ ہو۔

موت۔ (غضب ناک ہوکر) یہ کیا بڑ ہے؟

ڈاکٹر۔ یہ نہ بڑ ہے، نہ بکواس۔ یہ خالص سچائی ہے۔ بڑی بی، تم محض نام ہو اُس حادثہ کا، جو مادہ میں خامی اور تعمیر میں نقص کی وجہ سے ظہور میں آتا ہے۔

موت۔ مادہ میں خامی اور تعمیر میں نقص ؟

ڈاکٹر۔ ہاں بڑی بی۔ ذرا غور کرو انسان کس لئے مرتا ہے؟ چیزیں کیوں ٹوٹتی ہیں؟ یہ اس لئے تو نہیں ہوتا کہ تم آکر انہیں مارتی یا توڑتی ہو۔ یہ تو صرف اس لئے ہوتا ہے کہ جس مادہ سے وہ بنی ہوتی ہیں، وہ یا تو خام ہوتا ہے یا جس ڈھنگ سے وہ بنائی جاتی ہیں، اس میں نقص رہ جاتا ہے۔

موت۔ یہ غلط ہے۔

ڈاکٹر۔ یہ غلط نہیں، سو فیصدی درست ہے۔ بڑی بی، کارخانے مشین بناتے ہیں۔ ایک کارخانے کی مشین جلدی ٹوٹ جاتی ہے، لیکن دوسرے کی زیادہ عرصہ چلتی ہے۔ یہ اس لئے تو نہیں ہوتا کہ تم ایک کارخانہ پر ناراض ہو، دوسرے پر مہربان۔ یہ تو محض اس لئے ہوتا ہے کہ ایک کارخانہ جو دھات استعمال کرتا ہے، وہ دوسرے کارخانہ کی دھات کے مقابلہ میں کمزور ہوتی ہے۔ وہ جس طریقے سے ڈھلائی کرتا ہے، وہ دوسرے کارخانے کے مقابلے میں دھات کے ذرّوں کو دبا کر اتنا زیادہ ٹھوس نہیں بنا سکتا۔ اس لئے اس کی بنائی ہوئی چیزوں کے ذرّے جلد بکھرنے لگتے ہیں۔ اور لوگ بے احتیاطی میں کہہ دیتے ہیں اُن کا وقت آگیا۔ وہ مرگئیں، ٹوٹ گئیں۔

موت۔ لیکن اِنسان ؟

ڈاکٹر۔ یہاں بھی وہی بات ہے بڑی بی۔ اگر قدرت کا آرٹ مکمل ہوتا۔ اس کے بنانے کے ڈھنگ میں کمی نہ ہوتی، تو اِنسان کے رگ و ریشے اِتنے مضبوط بناتی، کہ وہ پرانے بیکار اور کمزور نہ پڑتے۔ تب اِنسان ہمیشہ زندہ رہتا اور تمہارا قصور ہی پیدا نہ ہوتا۔

موت۔ (بوکھلا کر) نہیں نہیں۔ یہ منطق کا طلسم ہے۔ الفاظ کا جادو ہے، ورنہ میں زندگی کی مالک ہوں۔

ڈاکٹر۔ نہیں۔ تم محض زندگی کی چاکر ہو۔

موت۔ (چلّا کر) کیا کہا۔ گستاخ مُنہ زور۔

ڈاکٹر۔ کہ تم زندگی کی چاکر ہو۔ ایک ادنیٰ چاکر، جس کا کام زندگی کو از سرِ نو زِندہ کرنا، اور تازہ و توانا کرنا ہے۔

موت۔ تیرا دماغ تو نہیں چل گیا سودائی؟

ڈاکٹر۔ بڑی بی۔ سچائی کبھی کبھی اِتنی عجیب و غریب ہوتی ہے کہ دماغ ماننے سے اِنکار کرتا ہے اور اس کا بیان کرنے والا پاگل اور سودائی نظر آتا ہے۔ لیکن سچائی سچائی رہتی ہے۔ اور تمہارے سلسلہ میں وہ صرف اِتنی ہے کہ تم کو زِندگی پر کوئی قابو نہیں رکھتیں۔

موت۔ (چیخ کر) میں اُسے مار بھی نہیں سکتی ؟

ڈاکٹر۔ نہیں۔ قطعی نہیں۔

موت۔ تو ابھی دیکھ۔ میں اِسی دم تجھے دکھاتی ہوں۔

ڈاکٹر۔ کِس طرح ؟

موت۔ تجھے مار کر، تجھے اِسی دم مٹا کر۔

ڈاکٹر۔ غلط۔ بڑی بی۔ اوّل تو تم مجھے مار نہیں سکتیں۔ لیکن اگر بحث کے لئے میں یہ

مان لوں، تو بھی عرض کروں گا کہ مر کر بھی میں نہیں مروں گا۔

موت۔ کیا کہا؟

ڈاکٹر۔ یہ کہ میں مر کر بھی نہیں مروں گا۔ بڑی بی، ذرا سوچ کر تمہاری اصطلاح میں مر کر بھی کیا ہوگا؟ میں یا تو دفن کیا جاؤں گا یا جلا دیا جاؤں گا۔ قبر میں دب کر میرا جسم کھاد بن جائے گا۔ آگ میں جل کر گیس اور راکھ بن جائیگا۔ کھاد اور راکھ سے سبزہ اُگے گا۔ گیس سے بادل بن کر مینہ برسے گا اور سبزہ کو پروان چڑھائے گا۔ پھر اس سبزہ کو سبزی اور چارہ کے روپ میں جاندار کھائیں گے۔ کھا کر ان کے جسم فربہ ہوں گے اور وہ نئی جانوں کو جنم دیں گے۔ اس طرح میں مرنے اور مٹنے کی بجائے تازہ اور مختلف روپوں میں اظہار پا جاؤں گا۔

موت۔ (بوکھلا کر) تو ... تو کیا میں اتنی لے دست و پا ہوں؟ میں کچھ بھی نہیں ہوں؟

ڈاکٹر۔ نہیں بڑی بی۔ ایسی بات بھی نہیں ہے۔ دراصل تم ایک کٹھالی ہو۔

موت۔ کٹھالی؟

ڈاکٹر۔ ہاں — مٹی کی وہ پیالی جس میں سنار ٹوٹے پھوٹے زیور ڈال کر گلاتا ہے۔

موت۔ ٹوٹے پھوٹے زیور ڈال کر گلاتا ہے؟ تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟

ڈاکٹر۔ جو شاید تمہاری سب سے خوبصورت اور موزوں تعبیر ہے۔ بڑی بی تم قدرت کی کٹھالی ہو۔ جب مادہ کمزور پڑ جاتا ہے، اس میں کھوٹ مل جاتا ہے، چمک دمک اور توانائی ضائع ہو جاتی ہے تو قدرت لے کر اسے تمہاری گود میں ڈال دیتی ہے۔ تم مادہ کو گلا کر اسے پرانی اور بوسیدہ شکلوں سے آزاد کر کے خالص عناصر میں تبدیل کرتی ہو، اور یہ عناصر نئے سرے سے نئی شکلوں میں نئی آب و تاب کے ساتھ ہستی کے آنگن میں پھر لہلہا اٹھتے ہیں۔

موت۔ (جیسے ڈوبتے تنکے کا سہارا لے کر) تب میری اپنی طاقت تو ہوتی ہے

ڈاکٹر۔ ہاں ـــــ لیکن مارنے کی نہیں۔ صرف زندگی کو زندہ کرنے کی۔ اس لئے اس تخریبی زعم میں نہ پھرو۔ کہ تم زندگی کو فنا کر سکتی ہو۔ اس گمراہ کن غلط فہمی میں نہ رہو کہ تم مجھ سے عظیم یا عظیم تر ہو۔ بڑی بی، تم تو محض اس بات کی ضمانت ہو، اس عمل کا اہتمام ہو کہ میں پھر اور پھر اور پھر پیدا ہوتا رہوں گا، اور ہر بار جب پیدا ہوں گا تو پہلے سے زیادہ زندہ جوان اور تابناک ہوں گا۔ (موت کی گردن جھک جاتی ہے)

اس لئے اُٹھ بڑی بی اور میرے جسم کے منتشر ہوتے ہوئے ڈھانچے کو اپنی کٹھالی میں ڈال کر پاک اور آزاد عناصر میں تبدیلی کرنے کا بندوبست کر دو۔

(ڈاکٹر گر پڑتا ہے۔ موت بڑے ادب سے گھٹنوں کے بل جھک کر ڈاکٹر پر جھکتی ہے اور اسے اپنے کالے لبادے سے ڈھک کر سرنگوں ہو جاتی ہے۔)

آگ، راکھ اور روشنی

(جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑی۔ رات کا وقت۔ گاہے گاہے سنتریوں کی آواز "تالا، جنگلہ، لالٹین سب ٹھیک ہے"۔ سنائی دیتی ہے۔)

رامداس۔ بارہ بج گئے موہن لال۔

موہن لال۔ ہاں رامداس جیل میں تمہاری آخری رات ختم ہوئی۔ کل رہائی ہوگی۔

رامداس۔ رہائی؟ موہن لال ویسے تم ٹھیک کہتے ہو، پر یہ بھی کتنا بڑا بھرم ہے۔ جیل سے رہا ہو کر کیا میں سچ مچ رہا ہو جاؤں گا؟

موہن لال۔ (چونک کر) کیوں؟

رامداس۔ جیل سے چھوٹ کر میرا تن ہی تو رہا ہو جائے گا۔ پر آتما ——— وہ تو تن کے پنجرے میں بند ہی رہے گی۔

موہن لال۔ (سمجھ کر) اوہ!

رامداس۔ ہاں موہن لال۔ تن کی رہائی پر کیا خوش ہونا۔ اصل رہائی تو اس دن ہوگی جس دن آتما اس تن سے چھوٹ جائے گی۔

موہن لال۔ (چونک کر) تمہارے خیالات اس قدر بدل گئے ہیں؟ رامداس یاد ہے۔ کبھی تم اس تن کی رہائی کے لئے ہی کتنے بے چین رہا کرتے تھے۔ اس تن کی رہائی کی خاطر ہی تم نے ہمارے جیلر کا گلا تک پکڑ لیا تھا۔

رامداس۔ ہاں موہن لال۔ پر وہ سب دس سال پہلے کی باتیں ہیں، جب رامداس ڈاکو تھا۔

جب اسکی آنکھوں پر موہ مایا کا پردہ پڑا تھا۔ جب وہ اس دنیا کی چیزوں اور شریر کے بھوگوں کو سب سے بڑا مانتا تھا۔ پر اب سب کچھ بدل گیا ہے۔

موہن لال۔ یہ میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ نو سال پہلے جب تم جیلر کو مارنے کی وجہ سے ہماری جیل سے بدل کر اس جیل میں بھیجے گئے تھے، تب تم ایسے نہ تھے۔ ان دنوں میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ دسیوں خون اور سینکڑوں ڈکیتیاں کرنے والا رامداس ایک دن بھگتی کے رنگ میں یوں رنگ سکتا ہے۔

رامداس۔ یہ میں بھی نہ سوچ سکتا تھا۔ لیکن اس جیل میں آیا تو میں نے اپنے کو ایک ایسے آدمی کے سامنے پایا، جس کے سامنے کھڑا ہونے کی، جس سے نظر ملانے کی طاقت مجھ میں نہ تھی۔

موہن لال۔ وہ کون تھا؟

رامداس۔ یہاں کے جیلر۔ پانڈے جی۔

موہن لال۔ وہی جن سے کہہ کر تم نے آج رات کے لئے مجھے اپنی کوٹھڑی میں رکھوایا؟

رامداس۔ ہاں وہی۔ موہن لال وہ نام کے جیلر ہیں۔ پر جتنی دیا اور جتنا دھرم ان میں ہے، اتنا شائد ہی کسی دوسرے میں ہو۔ انہوں نے مجھے ایک رات میں بدل کر رکھ دیا۔

موہن لال۔ ایک رات میں؟

رامداس۔ ہاں موہن لال۔ دراصل یہاں آکر بھی میں نے ایک رات وہی کیا۔ کوٹھڑی کا دروازہ بند کرتے ہوئے سنتری کو مار کر میں بھاگ نکلا، لیکن میں بھاگ نہ سکا۔ پکڑ لیا گیا اور پانڈے جی کے سامنے پیش کیا گیا۔ پانڈے جی نے مجھے دیکھا ــــ سپاہیوں کو باہر جانے کا حکم دیا۔ اور پھر چابیوں کی الماری سے ایک چابی نکال کر میرے آگے میز پر رکھ دی۔

(فلیش بیک شروع)

جیلر۔ (بڑی نرمی سے) رامداس یہ باہر کے دروازہ کی چابی ہے۔ تم اِس سے تالا کھول کر جا سکتے ہو۔

رامداس۔ (بھڑک کر) لیکن مَیں کُتا نہیں ہوں کہ کسی کی پھینکی بوٹی سے اپنی بھوک مٹاؤں۔ مَیں شیر ہوں، شکار کر کے کھاتا ہوں۔

جیلر۔ (اُسی نرمی سے) لیکن ایسے غلط طریقے سے شکار کرنا تو ٹھیک نہیں جس میں خود کو بے ضرورت نقصان پہنچ جائے۔

رامداس۔ (نفرت سے) اگر ایسا ہے تو تم غلط طریقے سے شکار کیوں کھیل رہے ہو؟

جیلر۔ غلط طریقے سے؟

رامداس۔ ہاں یہ چابی دے کر اور اپنے کو، اپنی نوکری کو بے ضرورت خطرے میں ڈال کر۔

جیلر۔ (گہرا سانس لے کر) میری بات کرتے ہو، رامداس میری بات جانے دو۔

رامداس۔ کیوں تم کوئی بہت دانی مہاتما ہو؟ مت بھولو کہ جب مَیں آزاد تھا تو تم جیسے سیکڑوں کی جھولیاں بھرتا تھا۔ مَیں تم سے کم دانی اور قربانی دینے والا آدمی نہیں ہوں۔

جیلر۔ یہ مَیں جانتا ہوں۔ اگر ایسا ہوتا تو ڈاکو ہونے کے باوجود تم غریبوں کی امداد نہ کرتے۔ لاوارثوں اور بیواؤں کو لوٹنے سے پرہیز نہ کرتے۔ عورتوں کے جسم کو ہاتھ لگانے سے گریز نہ کرتے۔ تم کسی دانی مہاتما سے کم نہیں ہو۔ لیکن تم نے گیان کی پہلی سیڑھی سے اُوپر نہیں دیکھا۔

رامداس۔ گیان کی پہلی سیڑھی سے اُوپر؟

جیلر۔ ہاں رامداس۔ تم میں دَیا ہے، دھرم ہے۔ پر تم نے اس جگ کا اصلی رُوپ دیکھنے کبھی کوشش نہیں کی۔

رامداس۔ (طنز سے) مَیں نے؟ پانڈے جی اِس جگ کو اور اس جگ کے رہنے والوں کو

جتنا مَیں نے دیکھا ہے، آپ عمر بھر نہیں دیکھ سکتے۔ آپ نے نوکری کر کے آرام کی زندگی گزاری ہے۔ مَیں نے اس جگ کے وہ کڑوے اور زہر بھرے گھونٹ پئے ہیں

جیلر۔ اور پھر بھی اس سچائی کو نہ جانا کہ یہ جگ ایسی چیز نہیں جس کے لئے آدمی اپنا سب کچھ گنوا دے۔ رامداس اگر تم نے جگ کا دُکھ اور کلیش بھرا رُوپ دیکھ لیا تو پھر اس کے پیچھے کیوں بھاگتے ہو؟

رامداس۔ اس سے بدلہ لینے کے لئے۔

جیلر۔ لیکن تم کس سے بدلہ لو گے؟

رامداس۔ جنہوں نے مجھے سزا دی، پہلے مجھے ڈاکو اور اب قیدی بنایا۔

جیلر۔ لیکن یہ تو کسی اور نے نہیں کیا۔ تم نے خود اپنے کو ڈاکو اور قیدی بنایا ہے۔

رامداس۔ (تیزی سے) کیا کہا؟

جیلر۔ یہی کہ تم کو کسی نے سزا نہیں دی۔ تم نے خود اپنے کو اس جھنجھٹ میں ڈالا۔

رامداس۔ کس طرح؟

جیلر۔ اس دُنیا کو اور اس دُنیا کی چیزوں کو پانے لائق سمجھ کر۔ پیار کرنے اور بھوگ کرنے لائق جان کر۔ رامداس اگر تم نے یہ سوچنے کی کوشش کی ہوتی کہ اَن سڑ جاتا ہے، کپڑے تار تار ہو جاتے ہیں، محل دو محلے گر جاتے ہیں اور وہ تن جو آج رُوپ کا پُتلا ہے کل بوڑھا ہو کر پرسوں مٹی ہو جاتا ہے تو تم کیوں چیزیں چھن جانے کا غم کرتے؟ چیزیں چھین لینے کی لالسا کس لئے کرتے؟

رامداس۔ (جیسے روشنی دیکھ کر) پانڈے جی!

جیلر۔ ہاں رامداس۔ تم نے تو مجھ سے زیادہ دھن اکٹھا کیا ہے۔ تم نے تو اس دُنیا کو مجھ سے زیادہ بھوگا ہے۔ مجھے بتاؤ، کیا تمہیں ترپتی ہوئی ہے؟ پیاس بجھی ہے؟ شانتی ملی ہے؟

راماداس۔ نہیں۔

جیسلر۔ پھر تم اس جگ کے پیچھے کیوں بھاگتے ہو؟ راماداس شانتی جگ کو پانے کے بجائے تیاگ کئے بیٹھے ہیں۔ اس میں لپت ہونے کے بجائے اس سے ورکت ہونے میں ہے۔ اس کی چاہ کرنے کے بجائے اُس کی چاہ کرنے میں جس کا ہم انش ہیں اور جس میں جاکر ہمیں آخر ملنا ہے۔

راماداس۔ (بہوت لفظوں کو دہراتا ہے) جس میں ہمیں ملنا ہے؟

جیسلر۔ ہاں۔ اُس پرم پتا پرماتما میں جس میں لین ہو جانا ہماری مکتی ہے۔ راماداس ہم پانی کی اُس بوند کی طرح ہیں جو گرمی کے بھپکائے میں بھاپ بن کر سمندر سے بچھڑ جاتی ہے۔ پھر پہاڑوں اور میدانوں میں ماری ماری پھرتی ہے کیسی طرح اُسی ساگر میں مل جانے کے لئے ہماری آتما بھی بھگوان سے بچھڑ گئی ہے۔ اسے پرماتما کی اور جانے دو۔

راماداس۔ (جیسے اونچا اٹھ رہا ہو) پانڈے جی۔ (پھر یکایک اداس ہوکر) لیکن... لیکن میں کیسے پرماتما کی اور جا سکتا ہوں۔ میرے اندر تو ایک ڈاکو کی آتما ہے۔

جیسلر۔ نہیں۔ تمہارے اندر بدھی ڈاکو کی ہے۔ عقل خونی کی ہے۔ آتما تو ہمیشہ پاک اور پوتر رہتی ہے۔ اس لئے بدھی کی نہ سنو۔ آتما کی سنو۔

راماداس۔ آتما کی سنوں؟

جیسلر۔ ہاں۔ اور ایک بار جب تم اس کی سن لوگے تو تمہیں بھٹکانے والی کوئی اور آواز سنائی نہ دے گی۔ تم تن کی بھوک اور من کے موہ سے چھوٹ کر ایک ایسی شانتی پا جاؤگے، جو تمہیں دولت اور عزت حاصل کرکے بھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور اسے حاصل کرنا خاص مشکل نہیں ہے۔ صرف کوشش کرنا ضروری ہے۔ سچے دل اور پورے دھیان سے کوشش۔

(فلیش بیک ختم)

رامداس - اور موہن لال میں نے جو کوشش کی تو مجھے ایسی شانتی مل گئی، جیسے سمندر کا بے چین پانی کسی کھاڑی کی گود میں جاکر سو جائے۔

موہن لال - تو انہیں نے تمہیں ایسا بنا دیا؟

رامداس - ہاں انہیں کی سنگت نے مجھے سکھایا کہ سچی شانتی۔

موہن لال - اور انہیں نے تمہیں ایسا بتایا؟

رامداس - ہاں انہیں نے مجھے بتایا کہ سچی شانتی دنیا کی چیزوں کے پیچھے نہ بھاگنے میں ہے۔

موہن لال - تو رہا ہونے کے بعد تم دنیا کی چیزوں کے پیچھے نہ بھاگو گے؟

رامداس - ایک بار بھول جان کر دوبارہ دہراؤں گا؟ موہن لال اب میں کم سے کم کھاؤں گا کم سے کم پہنوں گا - اپنی زیادہ سے زیادہ چاہوں کو ختم کروں گا۔

موہن لال - یعنی پہلے ڈاکو بنکر دنیا کو مارتے تھے۔ اب سادھو اور تیاگی بنکر اپنے کو مار ہوگے؟

رامداس - اپنے کو نہیں موہن لال - اپنی چاہتوں کو - اپنی اندریوں کو۔

موہن لال - اور انہیں مار کر کیا پاؤگے؟

رامداس - آتما کی شانتی -

موہن لال - آتما کی شانتی؟ یہ آتما کیا ہے؟

رامداس - تم آتما کو نہیں جانتے؟ مذاق مت کرو موہن لال - یہ مذاق کرنے کی بات نہیں ہے۔

موہن لال - (انتہائی سنجیدگی سے) رامداس، زندگی میں آج تک اتنا سنجیدہ کبھی نہیں ہوا۔ اس لئے سچ سچ بتاؤ - یہ آتما کیا ہے، جس کے پیچھے تم اپنے جسم کو فنا کئے جا رہے ہو؟

رامداس - یہ آدمی میں بھگوان کا انش ہے۔ خدا کا حصہ ہے۔

موہن لال - لیکن پھر میں پوچھ بیٹھوں گا - یہ بھگوان اور خدا کیا ہے؟ اس لئے جواب

دینے سے بچنے کے لئے ایک جھاڑی چھوڑ کر دوسری کے پیچھے نہ جاؤ۔

رامداس۔ تو سنو موہن لال۔ آتما انسان کے اندر وہ چیز ہے جو اسے حق کا سچائی کا، نیکی کا راستہ دکھاتی ہے۔

موہن لال۔ وہ تو عقل دکھاتی ہے۔

رامداس۔ نہیں عقل اور اندریاں انسان کو بہکاتی ہیں۔

موہن لال۔ یعنی جو انسان عقل کی اور اندریوں کی بات نہیں سنتا، آتما کی سنتا ہے، وہی سچے معنی میں عقلمند ہے؟

رامداس۔ ہاں۔

موہن لال۔ تب مجھے بتاؤ کہ تم اس آدمی کو پاگل کیوں کہتے ہو۔ جس کا دماغ کام نہیں کرتا۔ اس انسان کو بے وقوف کیوں کہتے ہو۔ جو کند ذہن ہوتا ہے۔ اس بچے کو نادان ناسمجھ کیوں کہتے ہو جس کا دماغ سوچ کی طاقت سے محروم ہوتا ہے۔ کیا تم ایک پاگل، بے وقوف اور بچے کی رہنمائی قبول کروگے؟

رامداس۔ (بے بس، لاجواب سا ہو کر) موہن لال۔

موہن لال۔ رامداس اگر تم عقل کے راستے سے ہٹ کر آتما کے راستے پر جانا چاہتے ہو، تو تمہیں بتانا ہوگا کہ یہ آتما کیسی ہے۔ جو عقل کی عدم موجودگی میں انسان کو پاگل اور احمق ہونے سے نہیں بچا سکتی۔ یہ آتما کیا ہے، جو عقل کے گم ہو جانے پر انسان کو ہوش و حواس میں بھی نہیں رکھ سکتی۔

رامداس۔ موہن لال! مجھ سے یہ سوال مت پوچھو۔ میں ایک سیدھا سادہ آدمی ہوں۔ سوچ کی الجھی ہوئی راہوں سے مجھے ہمیشہ ڈر لگتا ہے۔ اس لئے میں تم سے بحث نہ کرسکوں گا۔ لیکن اپنے تجربے کی بنا پر یہ ضرور کہہ سکوں گا کہ انسان کے اندر سے عقل کے علاوہ ایک اور آواز آتی ہے، اور وہ آواز انسان کو غلط بات

پر ٹوکتی ہے، بُرے کام سے روکتی ہے۔

موہن لال۔ اور تم اسے آتما، انتر آتما، یا ضمیر کی آواز کہنا چاہتے ہو؟

رامداس۔ ہاں موہن لال! تم اُسے کسی چیز کا نام دو۔ لیکن یہ آواز ایک حقیقت ہے اور ہمیشہ سچائی کا، اچھائی کا، نیکی کا راستہ جتاتی ہے۔

موہن لال۔ بس رامداس! تمہارے حساب کتاب میں یہی بنیادی بھول چوک ہو گئی ہے۔ یہی وہ کیلے کا چھلکا ہے جس پر پیر رکھنے سے تم پھسل گئے ہو۔ یہ درست ہے کہ انسان کے اندر سے عقل کے علاوہ ایک آواز اور بھی آتی ہے۔ لیکن یہ غلط ہے کہ یہ آواز سچائی کا یا نیکی کا راستہ دکھاتی ہے۔

رامداس۔ کیوں؟ کس لئے؟

موہن لال۔ اس لئے کہ یہ آواز سب کے اندر سے ایک جیسی نہیں آتی۔ یہ آواز ایک کو وہ راستہ بتاتی ہے، جسے ہم صحیح کہتے ہیں اور دوسرے کو وہ جسے ہم صریحاً غلط کہتے ہیں۔ یہ آواز ہر انسان، ہر زمانہ، ہر علاقہ اور اکثر ہر موقع کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔

رامداس۔ (حیرت سے) تم کیا کہتے ہو موہن لال؟

موہن لال۔ جو مذہب کی پیلی مدقوق کتابوں میں نہیں پڑھا۔ جو دھرم اور گیان کے اُپدیشکوں سے نہیں جانا۔ جو کچھ سمجھا ہے براہِ راست زندگی سے۔

رامداس۔ زندگی سے؟

موہن لال۔ ہاں رامداس۔ آج میں اپنی زندگی کے وہ ورق تمہارے سامنے کھولوں گا، جنہوں نے مجھے تیاگ، تپسیا، آتما اور آتما کی آواز کے سچّے رُوپ سے آگاہ کیا۔ تمہیں معلوم ہے میں کسی ناستک کا بیٹا نہیں ہوں۔ ایک بڑے آستک کا بیٹا ہوں۔

راماس۔ ہاں تم نے بتایا تھا۔ تمہارے پتا کوئی بڑے پنڈت تھے۔

موہن لال۔ ہاں۔ اور تمہارے جیلر کی طرح عقل اور اندریوں کو ٹھکرا کر آتما کی بات سوچتے سُنتے تھے۔ اس لئے انہوں نے زندگی بھر کوئی ٹھوس کام نہ کیا۔ وہ دھرم گرنتھ پڑھتے رہے اور گھر میں غریبی اور بچے بڑھتے رہے۔ اچھا کھانے کو نہ ملا، اچھا پہننے کو نہ ملا، بس ملتا رہا لیکچر۔ آتما کا، پرماتما کا، تیاگ کا اور تپسیا کا۔ لیکن آتما ہی کی سُننے سے، آتما ہی کی بھوک مٹانے سے کام نہیں چلتا۔ ایک اکیلے آدمی ہی کا نہیں، آنے والی ایک پوری نسل کا ستیاناس ہو جاتا ہے، اس کا ثبوت ملا اُس دن، جس دن میرے بڑے بھائی کو ہتھکڑی لگا کر کچہری میں پیش کیا گیا —— چوری کے الزام میں۔

(فلیش بیک شروع۔ عدالت کا منظر)

جج۔ (با رعب آواز میں) تم پنڈت دوارکا پرشاد کے لڑکے ہو؟

بھائی۔ ہاں۔

جج۔ تم جانتے ہو تمہارے پتا کون ہیں؟

بھائی۔ ایک بڑے پنڈت۔

جج۔ اور تم نے اُن کے بیٹے ہو کر چوری کی؟ تمہیں شرم نہیں آتی؟

بھائی۔ نہیں۔

جج۔ کیا کہا؟

بھائی۔ مجھے شرم نہیں آتی۔

جج۔ تم اس قدر ڈھیٹ ہو گئے ہو؟

بھائی۔ نہیں۔ میں اس قدر ترسا ہُوا ہُوں۔ کھانے کے لئے، پہننے کے لئے، اُن تمام چیزوں کے لئے، جو میری عمر کے ایک لڑکے کو ملنی چاہئیں۔

جج - کیوں تمہارے گھر میں کچھ نہیں ہے ؟

بھائی - (نفرت سے) میرے گھر میں صرف پتاجی کی وہ پُرانی گلی سڑی کتابیں ہیں، جنہیں ردی کے بھاؤ بھی نہیں بیچا جا سکتا۔ اور دھرم کی وہ باتیں ہیں جن سے خود اُن کا پیٹ کبھی پوری طرح نہیں بھرا۔

جج - (غضب ناک ہوکر) لڑکے تم اپنی عمر سے زیادہ عقلمندی کی باتیں کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔

بھائی - جج صاحب اگر آپ بھی میرے گھر میں ہوتے، اگر آپ بھی رُوکھا کھاتے اور موٹا اور میلا پہنتے، اگر آپ بھی دیکھتے پتاجی اِس لوک کی نہیں، اُس لوک کی فکر کرتے ہیں۔ اس جسم کو سُدھارنے کے لئے کام نہیں بلکہ اُس جنم سنوارنے کے لئے دھیان کرتے ہیں۔ تو شاید آپ بھی میری طرح عمر سے زیادہ باتیں کرنے لگتے۔

جج - لیکن چوری نہ کرتا۔

بھائی - شاید نہ کرتے جج صاحب۔ لیکن جس نے اپنے باپ سے صرف کتھا کرنا اور جاپ کرنا سیکھا ہو، جس نے نیوتے کے رُوپ میں دوسروں کا مال کھانا اور دان کے رُوپ میں دُوسروں کا دھن ہتھیانا سیکھا ہو، وہ اپنی ضرورتیں اپنی چاہتیں اور کِس طرح پُوری کر سکتا ہے ؟

جج - لیکن کیا تم اپنی چاہتوں اور ضرورتوں کو دبا نہیں سکتے تھے ؟

بھائی - جج صاحب۔ پتاجی نے اپنی ضرورتوں اور خواہشوں کو دبانا چاہا۔ انہوں نے اپنی آتما کو دُنیا کی چیزوں سے ورکت کرنا چاہا۔ اُس کا نتیجہ کیا نِکلا ؟ وہ بھوکے رہے اور ترسے ہُوئے رہے۔ اور انہوں نے اپنی اولاد کی تقدیر میں بھی لِکھ دی، وہی بھُوک، وہی پیاس، وہی ترشنا۔ میرے اور میرے بھائیوں

کے چہروں کو دیکھتے گیا۔ اس عمر میں ہم کیوں سر منڈے، ننگے بھوکے اور سنجیدہ رہتے کے لئے ہیں؟ جج صاحب، میں اس خواہش کے دبانے کے فلسفے پر یقین نہیں رکھوں گا، چاہے مجھے چوری کرنی پڑے، ڈاکہ ڈالنا پڑے۔

(فلیش بیک ختم)

رامداس۔ تو کیا ہوا؟ جج نے اُنہیں چھوڑ دیا؟

موہن لال۔ ہاں۔ جج نے اُنہیں لڑکا جان کر چھوڑ دیا لیکن اُنہوں نے اپنی عادتیں نہ چھوڑیں۔ وہ چوری کرتے رہے۔ اور ایک دن جب وہ چوری کرتے ہوئے گھر گئے اور پکڑے جانے کے سوا کوئی چارا نہ رہا، تو وہ تیسری منزل سے کود گئے۔ زندگی جو مجسم آگ تھی، آن کی آن میں سرد ہوگئی۔

رامداس۔ (المناک لہجہ میں) وہ مر گئے؟

موہن لال۔ ہاں۔ لیکن اُنہوں نے میرے دماغ کو بُری طرح جھنجھوڑ دیا۔ میں نے اُس فلسفے کا بھیانک انجام دیکھ لیا، جو بھگوان کے دھیان میں لین رہنے کو جنم سپھل بنانا اور کام کرنے کو پاپ بتا جنم گنوانا کہتا ہے۔ میں نے پتا جی کی مرضی کے خلاف ایک جگہ آدھے وقت کی نوکری کر لی اور پڑھنا شروع کیا۔ میں نے میٹرک پاس کر لیا۔ مجھے ایک اچھی نوکری مل گئی۔ لیکن آتمانے پھر بھی میرا پیچھا نہ چھوڑا۔ ایک دن اس کی آواز میرے کانوں سے بھی ٹکرانے لگی۔

(فلیش بیک شروع۔ گھر کا منظر)

باپ۔ کیا کہا تم نے؟

موہن لال۔ میں سٹیشن ماسٹر صاحب کی لڑکی سے شادی کروں گا۔

باپ۔ اُسی اسٹیشن ماسٹر کی جو اناتھ آشرم سے نہ جانے کس ذات کی عورت کر لایا تھا؟

موہن لال ۔ جی ہاں ۔
باپ ۔ موہن لال! تو ہوش میں ہے ۔ تیری مت تو بھرشٹ نہیں ہو گئی ؟
موہن لال ۔ پتاجی ۔ آپ اُس لڑکی کو دیکھئے تو......
باپ ۔ اُس عورت کی لڑکی کو جس کی شادی بھی شاستر ودھی سے نہیں ہوئی ؟ موہن لال!
میں تجھ سے صاف صاف کہے دیتا ہوں کہ اگر تو نے دوبارہ ایسے ادھرم کی
بات میرے سامنے اُٹھائی تو مجھ سے بُرا نہ ہو گا ۔
موہن لال ۔ یہ اُدھرم کی بات ہے ؟
باپ ۔ تو کیا یہ دھرم کی بات ہے اگیانی ؟ کہاں ایک بے ذات کی عورت اور کہاں
ایک بھاردواج رشی کا کُل ۔ تو ایک نیچے کو اُونچے لوگوں سے ملانا چاہتا
ہے ؟
موہن لال ۔ پتاجی بُرا نہ مانئے گا ۔ ہم کس بات میں اُن سے اُونچے ہیں ؟ کیا ہم اُن سے
زیادہ خوبصورت ہیں ؟ زیادہ پڑھے لکھے ہیں ؟ زیادہ گیانی ہیں ؟
باپ ۔ ارے اگیانی، تو شریر کی بات کرتا ہے ۔ یہ آتما کی بات ہے ۔ ہماری آتما اُونچے
درجے کی ہے ۔
موہن لال ۔ لیکن اگر ایسی ہی بات ہے تو آپ کا ایک بیٹا چور کیوں نکلا ؟
باپ ۔ (چلا کر) موہن لال!
موہن لال ۔ (بلا خوف) پتاجی ۔ میرے مُنہ سے وہ باتیں نہ نکلوائیے، جن سے آپ
کو اور مجھ کو دونوں کو دُکھ ہو گا ۔ میں صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اپنی
جاتی اور کُل کے غرور کو اتنی اہمیت نہ دیجئے ۔
باپ ۔ تو اسے غرور کہتا ہے، گھمنڈ کہتا ہے ؟ ارے یہ میری آتما کا وشواش ہے ۔
اُس کی آواز ہے ۔

موہن لال۔ کہ دوسری ذات کا آدمی چھوٹا ہے؟ نیچا ہے؟ اچھا ہونے پر بھی اپنانے کے لائق نہیں ہے؟

باپ۔ ہاں۔ کہ جو ذات کا اونچا نہیں، جو کل کا پوتر نہیں ہے، وہ اپنانے کے لائق نہیں ہے۔

موہن لال۔ لیکن میرا دماغ یہ قبول نہیں کرتا۔

باپ۔ ہاں۔ تیرا دماغ قبول نہیں کرے گا، کیونکہ ادھرم کی تعلیم سے وہ بھرشٹ ہو گیا ہے۔ (یکایک نرم ہو کر) لیکن بیٹے تو اپنی آتما کو ٹٹول۔ اُس کی آواز کو سُن۔ وہ ضرور تجھے صحیح راستہ بتائے گی؟

موہن لال۔ (مکمل سنجیدگی سے) پتا جی میں نے اپنے اندر سے آنے والی ہر آواز کو سُننے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ہر آواز نے مجھے یہی کہا ہے۔ اُس سے شادی کر لے کیونکہ یہ کسی طرح غلط نہیں ہے۔

باپ۔ (غضب ناک ہو کر) موہن لال!

موہن لال۔ ہاں۔ پتا جی میں اُس سے شادی کروں گا۔

باپ۔ تب میرا بھی فیصلہ سُن لے۔ اگر تو نے اُس لڑکی سے شادی کی تو میں زندہ نہیں رہوں گا۔

موہن لال۔ (کانپ کر) پتا جی۔

باپ۔ ہاں میں تیرا باپ ہوں۔ مجھے تجھ سے پیار ہے۔ مجھے اپنی زندگی سے پیار ہے۔ لیکن میں اُس کام کو برداشت نہیں کر سکتا، جو میری آتما کو قبول نہیں۔ جو میری آتما کی آواز کے انوکول نہیں۔

موہن لال۔ اور یہ شادی ایسا ہی کام ہے؟

باپ۔ ہاں۔ بالکل ایسا۔ سو فیصدی ایسا۔ میں آتما کے خلاف نہیں جاؤں گا۔

موہن لال - تو پھر مَیں بھی شادی کر کے رہوں گا۔ مَیں بھی اپنی آتما کے خلاف ہو جاؤں گا۔

(فلیش بیک ختم)

موہن لال - لیکن مَیں اپنی آتما کے مطابق نہ چل سکا، کیونکہ پتا جی نے اُسی شام زہر کھا لیا۔

رامداس - (چونک کر) زہر؟

موہن لال - ہاں رامداس۔ شام کو جب مَیں لوٹا تو مَیں نے دیکھا گھر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ لیکن پتا جی خاموش آنکھیں مُوندے پڑے تھے۔ اُن کے ہونٹ نیلے پڑ گئے تھے مگر اُن کے چہرے پر ایک عجیب طرح کی شانتی تھی۔ ایسی رُوحانی شانتی جو عین آتما اور رُوح کے مطابق عمل کرنے سے پیدا ہوتی ہے تب یکایک مجھے خیال آیا، یہ آتما کیا چیز ہے کہ ایک ہی وقت میں دو آدمیوں سے دو بات کہتی ہے۔ ایک دوسرے سے بالکل اُلٹ باتیں کہتی ہے۔ یہ مجھ سے کہتی ہے کہ شادی کر کہ یہ ٹھیک ہے۔ ان سے کہتی ہے کہ جی جان سے مخالفت کر کہ یہ غلط ہے۔ تو کیا ہر آتما کی آواز الگ ہوتی ہے؟ کیا اُن کے سچ جُدا جُدا ہوتے ہیں؟ لیکن سچ تو ایک ہوتا ہے۔ پھر ہماری آتماؤں کے سچ ایک دوسرے سے الگ، ایک دوسرے کے دشمن کیوں۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ سچ کا اظہار آتما کے ذریعے نہیں ہوتا۔ اُس دن سے میرا یہی ایمان ہو گیا۔ مَیں نے آتما کی آواز کو حق کی آواز تسلیم کرنا بند کر دیا۔ اور میرا یہ ایمان غلط ثابت نہ ہُوا۔ مجھے اس کے دُرست ہونے کے اَور ثبوت ملے۔

رامداس - اسی بات کے ثبوت؟

موہن لال - ہاں رام داس۔ مَیں سخت بیمار تھا۔ میری بیوی میرے سرہانے بیٹھی تھی۔ یکایک میری حالت بہت گرنے لگی، اور مجھے محسوس ہُوا۔ مَیں مرنے والا ہُوں۔

(فلیش بیک شروع)

موہن لال ۔(کمزور آواز میں) کانتا ۔

کانتا ۔ جی ۔

موہن لال ۔ کانتا ! میری ایک بات مانو گی ؟

کانتا ۔ (خوفزدہ ہوکر) کیا ؟

موہن لال ۔ کانتا میں اب جانے والا ہوں ۔

کانتا ۔ (چونکر) کیا ؟ نہیں نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ میں ڈاکٹر کو بلا لاتی ہوں ۔

موہن لال ۔ کانتا میرے پاس سے نہ جاؤ ۔ یہیں بیٹھو ۔

کانتا ۔ (اسی لہجہ میں) نہیں میں ڈاکٹر کو بلا لاؤں ۔

موہن لال ۔ اب اس کے بلانے سے کچھ نہ ہوگا کانتا ! میری آخری بات سنو !

کانتا ۔ نہیں نہیں ۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا ۔ تم ٹھیک ہو جاؤ گے ۔

موہن لال ۔ پہلو میں ٹھیک ہو جاؤں گا لیکن میری بات سنو ۔ کانتا میری ایک بات مانو گی ؟

کانتا ۔ کیا ؟

موہن لال ۔ وعدہ کرو ۔

کانتا ۔ نہیں ۔ پہلے بتاؤ ۔ آج تک تم نے مجھ سے کوئی وعدہ نہیں لیا ۔ آج لے رہے ہو ۔ ضرور کوئی ایسی ویسی بات ہے ۔

موہن لال ۔ نہیں کانتا ۔ ایسی ویسی کوئی بات نہیں ہے ۔ وہ بہت سیدھی بات ہے ۔

کانتا ۔ کیا ؟

موہن لال ۔ تیری عمر بہت کم ہے کانتا ۔ میرے بعد شادی کر لینا ۔

کانتا ۔ (چیخ کر) کیا ؟ تم میرے لئے ایسے کہتے ہو ؟ تم نے مجھے ایسا سمجھا ہے ؟ ہائے

مَیں اتنی پتیت ہُوں؟ اتنی نیچی اور گری ہوئی ہُوں؟

(چار پائی کی پٹی پر سر پھوڑنا شروع کر دیتی ہے)

موہن لال۔ (گھبرا کر) ارے یہ کیا؟ تم نے سر پھوڑنا شروع کر دیا۔ کانتا سُنو۔

کانتا۔ (روتے ہُوئے) نہیں۔ اگر مَیں دوسرے بیاہ کے لئے جی رہی ہُوں تو مَیں ابھی اپنے پران چھوڑ دُوں گی۔ مَیں اسی دم مر جاؤں گی۔

موہن لال۔ کانتا! میری کانتا، سُنو۔ لو مَیں نے اپنے لفظ واپس لئے۔ مجھے معاف کر دو۔ تمہیں میری قسم۔

کانتا۔ (آنسو روکتے ہوئے) لیکن تم نے یہ کیوں کہا؟ میری آتما پر ایسا گھاؤ کیوں لگایا؟ کیا مَیں اس لئے جی رہی ہوں کہ دُوسرا آدمی مجھے ہاتھ لگائے۔ مَیں دُوسرے آدمی کو انہیں نگاہوں سے دیکھوں جن سے تمہیں دیکھتی ہوں؟ تم مجھے مار دیتا بڑی سے بڑی سزا دے دیتا۔ لیکن آگے سے میری آتما پر ایسا گھاؤ نہ لگانا۔

(فلیش بیک ختم)

موہن لال۔ رامداس! یہ ایک عورت کی آتما کی آواز تھی، جو اپنے پتی کے مر جانے کے بعد بھی دوسری شادی کرنے کی بات سُننے کو تیار نہ تھی لیکن پندرہ سولہ سال بعد جب وہ مر گئی تو مالا بار ساحل کے ایک گاؤں میں میری زندگی میں ایک عورت آئی۔ اس کے بھی آتما تھی۔ اور جب مَیں نے اس کی آتما کی آواز سُنی تو مَیں ششدر رہ گیا۔

(فلیش بیک شروع)

پدمنی۔ (شوخی سے) کیا سوچ رہے ہو؟

موہن لال۔ (سنجیدگی سے) کچھ نہیں۔

موہن لال۔ ہاں۔

پدمنی۔ مجھے چھوڑکر؟

موہن لال۔ ہاں۔جانا ہی ہوگا۔

پدمنی۔کیوں؟

موہن لال۔(اُداسی سے)کیوں؟ پدمنی زندگی میں کچھ ملاقاتیں محض ملاقاتیں رہنے کے لئے ہوتی ہیں۔کچھ پھول حسرت سے تکنے کیلئے ہوتے ہیں،کوٹ کے کاج میں ٹانکنے کے لئے نہیں۔

پدمنی۔(نہ سمجھ کر معصومیت سے)بھلا کیوں؟

موہن لال۔اس لئے کہ وہ پھول کسی پر چڑھ چکے ہوتے ہیں یا کسی کے ہو چکے ہوتے ہیں۔

پدمنی۔تو کیا ہُوا؟

موہن لال۔(حیرت سے)تو کچھ نہیں ہُوا؟ تمہاری شادی ہو چکی ہے۔تم کسی کی ہو چکی ہو۔اس سے کچھ نہیں ہُوا؟

پدمنی۔(اُسی معصومیت سے)نہیں اس سے کیا ہُوا؟

موہن لال۔(تقریباً مجروح)کچھ نہیں ہُوا؟

پدمنی۔(قدرے پریشان ہوکر)کیوں؟ مجھے ایسے کیسے دیکھ رہے ہو؟

موہن لال۔پدمنی تمہاری شادی ہوگئی۔تمہارا شوہر ہے اور تم میری ہونے کی بات کر رہی ہو۔

پدمنی۔ہاں۔اس میں کیا عیب ہے؟

موہن لال۔(حیرت سے)اس میں عیب نہیں ہے؟

پدمنی۔کیا عیب ہے؟ ایک آدمی ہے۔دوسرا اچھا لگا۔اُسے بھی کر لیا۔

موہن لال۔(سختی سے)پدمنی تمہیں ایسا کہتے شرم نہیں آرہی۔

پدمنی۔(کچھ نہ سمجھ کر)شرم! کیسی شرم! تم کیسی بات کہہ رہے ہو؟

موہن لال۔ تم کو ایک آدمی کے ہوتے ہوئے دُوسرے آدمی سے شادی کی بات سوچتے ہوئے شرم نہیں آتی ؟

پدمنی۔ نہیں تو۔

موہن لال۔ تمہاری آتما تمہیں لعنت ملامت نہیں کرتی ؟

پدمنی۔ (شکوے کے لہجے میں) مجھے کیوں لعنت ملازمت کرتی ہیں کوئی بُرا کام کر رہی ہوں ؟ تم نے مجھے ڈُوبتے سے بچایا تھا۔ تم مجھے اچھے لگتے ہو۔ میری آتما تم سے بھی شادی کرنے کو کہتی ہے۔

موہن لال۔ تُم کیا کہہ رہی ہو ؟ کیا اس بات کو یہاں کے لوگ بُرا نہ کہیں گے ؟

پدمنی۔ کیوں بُرا کہیں گے ؟ یہاں تو ہوتا ہی ایسا ہے۔

موہن لال۔ (چونک کر) کیسا ؟

پدمنی۔ عورتوں کا ایک سے زیادہ بیاہ کرنا۔

موہن لال۔ ایک آدمی کے ہوتے ہوئے ؟

پدمنی۔ ہاں۔ ہمارے ہاں تو عورتوں کے چار چار آدمی ہوتے ہیں۔ میری ماں کے تین آدمی تھے۔ میرا تو.... (شرما کر) میرا تو ابھی دُوسرا ہی ہوگا۔

(فلیش بیک ختم)

رامداس۔ (نفرت سے جلتے لہجہ میں) وہ کیسی عورت تھی۔

موہن لال۔ وہ ؟ رامداس وہ ویسی ہی عورت تھی جیسی کہ دروپدی۔

رامداس۔ (بھڑک کر) یہ کیا کہہ رہے ہو موہن لال ؟

موہن لال۔ جو ٹھیک ہے۔ وہ کوئی آوارہ عورت نہ تھی۔ اُس کی آتما بھی میری بیوی کی آتما کی طرح پوتر تھی۔

رامداس۔ پھر تمہاری بیوی کی طرح اُس کی آتما نے دُوسرا آدمی کرنے کی بات پڑھے

کیوں نہ ٹوٹ سکا؟

موہن لال۔ یہی تو میں تمہیں غور کرنے کو کہہ رہا ہوں۔ رامداس اس کی آتما نے اسے نہ ٹوکا، کیونکہ وہ اُس سماج کی عورت نہ تھی جس سماج کی میری بیوی تھی۔ دروپدی کے سماج کی طرح اس کے سماج میں بھی ایک سے زیادہ آدمی کرنے کو بُرا نہیں مانا جاتا تھا۔

رامداس۔ لیکن اس سے کیا ہوا؟ ایک سماج کے مان لینے سے بُری بات اچھی تو نہیں بن جاتی۔ اس کا فیصلہ تو آتما کرتی ہے۔

موہن لال۔ (تیزی سے) کونسی آتما؟ میرے پتا کی آتما یا میری آتما، میری بیوی کی آتما یا پدمنی کی آتما، سیتا کی آتما یا دروپدی کی آتما؟

رامداس۔ موہن لال! تم یہ مجھے کس طرح اُلجھا رہے ہو۔

موہن لال۔ رامداس! میں نے اپنی زندگی کے بہترین لمحے اس سوال کے حل کرنے میں لگائے ہیں۔ میں نے اپنے اندر اُٹھتی ہوئی مختلف آوازوں کو ایک دوسرے سے ملا کر، عقل اور ادراک کی کسوٹی پر کَسا ہے۔ اور آخر کار میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آتما جیسی کوئی چیز انسان کے اندر نہیں ہے۔ عقل کے علاوہ جو آواز ہمارے اندر سے آتی ہے۔ وہ آنکھ مُوند کر بھروسہ کرنے کے قابل نہیں ہے۔

رامداس۔ لیکن وہ آواز کس کی ہے؟ اسکی اصلیت کیا ہے؟

موہن لال۔ وہ سنسکاروں کی آواز ہے۔

رامداس۔ سنسکاروں کی؟

موہن لال۔ ہاں رامداس ہم ——— ہم ہی نہیں ہیں۔ ہم وہ بھی ہیں جو ہمارے ماں باپ اور آباد و اجداد تھے۔ ہم اُن کی جسمانی خصوصیتیں ہی لے کے

پیدا نہیں ہوئے ہیں۔ ہم ان کے سوچنے اور محسوس کرنے کی کچھ عادتیں بھی
لے کے پیدا ہوئے ہیں۔ ان کے اثر اور ان کی تعلیم سے اُبھر کر یہ عادتیں
ہمارے ذہنوں پر اس طرح حاوی ہو جاتی ہیں کہ سب سے پہلے اور اکثر سب
سے زور دار طور پر ہم اُنہیں کی آوازیں سُنتے ہیں۔

رامداس۔ لیکن کیا ان آوازوں میں سچائی نہیں ہوتی؟

موہن لال۔ اُن میں سچائی ہوتی ہے مگر صرف اُس زمانے کی، اُن حالات کی، اُن خیالات کی،
جو ہمارے آباؤ اجداد کی زندگی کا حصہ تھے۔ وہ ہمیشہ ہماری زندگی کی
سچائیاں نہیں بن سکتیں۔

رامداس۔ لیکن کیوں؟

موہن لال۔ اس لئے کہ ہم انسان ہیں پیڑ اور پودے نہیں ہیں، جو آج بھی ویسے
ہی نہیں جیسے ہزار سال پہلے تھے اور ہزار سال بعد بھی شائد ایسے ہی
رہیں گے۔ ہم اور لتے بدلتے رہتے ہیں۔ آج ہم ویسے نہیں ہیں، جیسے کبھی
تھے اور آئندہ ایسے نہیں رہیں گے، جیسے اب ہیں۔ اس لئے پیڑ پودوں کی
طرح ہماری زندگی لگے گلے بندھے پیچ نہیں ہو سکتے۔

رامداس۔ تو کیا دیا اور دھرم، رحم اور انصاف بھی ہماری زندگی کی اٹل اور اصل سچائیاں
نہیں ہیں؟

موہن لال۔ نہیں رامداس دیا دھرم کے راستے پر بھی آنکھ مُوند کر نہیں چلا جا سکتا۔ وہاں
بھی عقل کی روشنی سے کام لینا پڑتا ہے۔ اپنی زندگی کی پہلی اور آخری قید میں
نے دیا اور دھرم کے چکر میں پڑ کر کاٹی ہے۔

رامداس۔ (حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر) دیا اور دھرم کے چکر میں پڑ کر؟

موہن لال۔ ہاں۔ وہ سنسکار جو پتا جی کی معرفت میرے اندر آئے، کوشش کرنے کے باوجود

بھی مرے نہیں ہیں۔ عقل کی آنکھ لگتے ہی یا عقل کی آنکھ کھلنے سے پہلے ہی وہ اکثر گُل کھلا جاتے ہیں بڑے پتے کی بات ہے۔ اپنی بیوی کے مرنے کے بعد میں فوج میں بھرتی ہو گیا تھا۔ ہماری یونٹ ایک مورچے پر تعینات تھی۔ ایک دن کچھ خُفیہ نقشے کھو گئے۔ یقیناً وہ اُن آدمیوں میں سے کسی نے چُرائے تھے جو پاس کے گاؤں سے رسد لیکر آتے تھے۔ پُوچھ تاچھ میں اُن سب نے انکار کر دیا۔ اِس لئے کمانڈر نے سب کو گولی سے اُڑا دینے کا حُکم دیا۔ جن لوگوں کو گولی مارنے کا کام سونپا گیا، اُن میں میں بھی تھا۔ رائفل لیکر میں قطار میں کھڑا ہو گیا۔ سب نے گولیاں داغیں [illegible] میں دیا دھرم کی رو میں بہہ گیا۔ اگلی صبح میں کورٹ مارشل کے سامنے تھا۔

(فلیش بیک شروع۔ فوجی عدالت کا منظر)

کرنل۔ تم اقبال کرتے ہو کہ تم نے کمانڈر کے حُکم کے باوجود گولی چلانے سے اِنکار کیا؟

موہن لال۔ مَیں نے اِنکار نہیں کیا۔ مَیں صرف گولی چلا نہ سکا۔

کرنل۔ کِس وجہ سے؟

موہن لال۔ معلوم نہیں کیوں۔ میری آتما نے کہا یہ غلط ہے؟ یہ بے رحمی ہے۔

کرنل۔ کیا غلط ہے؟ کیا بے رحمی ہے؟

موہن لال۔ ان آدمیوں پر گولی چلانا جو معصوم اور بے گُناہ بھی ہو سکتے ہیں؟

کرنل۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ سب بے گُناہ تھے؟

موہن لال۔ سب نہیں۔ لیکن سب گنہگار بھی نہیں ہو سکتے۔

کرنل۔ یہ تم کِس طرح کہتے ہو؟

موہن لال۔ اندازے سے؟

کرنل۔ تو اندازے سے تم یہ بتا سکتے ہو کہ ان میں سے کس کس نے نقشے چُرائے تھے؟

موہن لال۔ نہیں!

کرنل۔ تو پھر تم نے یہ فیصلہ کیسے کیا کہ جس آدمی کو تمہیں گولی مارنی تھی، وہ معصوم تھا۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ اصلی مجرم وہی ہو۔ کیوں؟

موہن لال۔ (لاجواب ہو کر) جی؟ جی ہاں۔

کرنل۔ پھر تم نے اپنے کمانڈر کی حکم عدولی کیوں کی؟ فوج کے ڈسپلن کو توڑ کر جرم کا ارتکاب کیوں کیا؟

موہن لال۔ (گہرا سانس لیکر) میں ۔۔ عور رحم کی رو میں بہہ گیا تھا۔ دھرم نے میرے ہاتھ پکڑ لئے تھے۔

کرنل۔ لیکن اگر ہم باقی فوجی لوگ بھی رحم کی رو میں بہہ جائیں۔ اگر ہم بھی دیا دھرم کو اپنے ہاتھ پکڑ لینے دیں تو جانتے ہو کیا ہوگا؟ ہماری آتماؤں کو تو شانتی نصیب ہوگی یا نہ ہوگی۔ اس چکر میں ملک ضرور تباہ ہو جائیں گے ۔ قومیں ضرور غلام ہو جائیں گی۔ ہمیں بھی معلوم ہے کہ ان پانچ آدمیوں میں سے کچھ معصوم ہوں گے۔ لیکن ہم کس طرح معلوم کریں کہ چور کون ہے۔ اگر تمہاری طرح اندازے سے ہم کچھ آدمیوں کو دیا دکھا کر چھوڑ دیں تو ہو سکتا ہے جو چور ہے وہ بچ جائے اور اس کی مخبری سے ہماری یونٹ ہی نہیں، پوری بٹالین دشمن کا شکار ہو جائے۔ کیا تم اپنے دیا دھرم کی بھینٹ پر اپنی بٹالین کے ہزاروں سپاہیوں کی جانوں کو قربان کرنا چاہتے ہو؟

موہن لال۔ (عجلت سے) نہیں۔ ہرگز نہیں۔

کرنل۔ تو تمہیں اعتراف ہے۔ تم نے غلطی کی؟ جرم کیا؟

موہن لال۔ (عظمت کے ساتھ) مجھے اعتراف ہی نہیں۔ شرمندگی بھی ہے۔ میں اپنے کئے کی سزا چاہتا ہوں۔

(فلیش بیک ختم)

موہن لال ۔ اور غلطی قبول کر لینے کی وجہ سے کورٹ مارشل نے مجھے موت کے بجائے دو سال قید کی سزا دی۔ میں نے اس قید کو ایک ایسی سزا کے طور پر قبول کیا جس نے مجھ پر یہ سچائی ظاہر کر دیا اور دھرم زندگی کے دوست نہیں، دشمن بھی ہو سکتے ہیں۔ اسلئے دنیا کے راستے پر بھی آتما کے اکسانے پر چلنا ٹھیک نہ ہوگا۔ ساری زندگی میں اس اصول پر چلتا رہا لیکن دس سال پہلے پھر ڈگمگا گیا۔

(فلیش بیک شروع - عدالت کا منظر)

جج ۔ تم نے مقتول رام لال کا قتل کیا ؟

موہن لال ۔ جی ہاں ۔

جج ۔ تمہیں معلوم ہے کہ قتل کرنا جرم ہے ؟

موہن لال ۔ جی ۔

جج ۔ تم جرم کرنے کی وجہ سے ایک بار پہلے بھی سزا پا چکے ہو ؟

موہن لال ۔ جی ۔

جج پھر تم نے یہ جرأت کیوں کی ؟

موہن لال ۔ اس لئے کہ میری آتما نے کہا ۔

جج ۔ (چونک کر) تمہاری آتما نے ؟ وہ کس لئے ؟

موہن لال ۔ اس لئے کہ آپ نے خود انصاف نہیں کیا ؟

جج ۔ (اور چونکا کر) ہم نے انصاف نہیں کیا ؟

موہن لال ۔ ہاں —— آپ نے مقتول رام لال کو بری کر دیا تھا ؟

جج ۔ کس کیس میں ؟

موہن لال ۔ میری بھتیجی وملا کی موت کا سبب بننے کے کیس میں ۔

موہن لال۔ پھر اسے عمل میں لانے کی اجازت کیوں نہ دی جائے؟

جج۔ اس لئے کہ اجازت دینے سے کوئی فائدہ نہیں۔ موہن لال اگر رام لال تم سے کمزور نہ ہوتا تو کیا تم اسے مار سکتے تھے؟

موہن لال۔ شائد نہیں۔

جج۔ بس یہی مجبوری راستے میں حائل ہے۔ اگر ہر آدمی کو انصاف کا تقاضا پورا کرنے کی اجازت دے دی جائے تو بہت کم آدمی انصاف کے تقاضے پورے کر سکیں گے۔ کیونکہ بہت کم آدمی اتنی طاقت رکھتے ہیں کہ خود ملزم کو سزا دے سکیں۔ اس لئے سب نے مل کر انصاف کرنے کی طاقت قانون جاننے والے ایسے تیسرے آدمیوں کے ہاتھوں میں سونپ دی ہے جو ہمدردی اور نفرت دونوں سے اُوپر رہ کر محض عقل کی بنا پر فیصلہ کرتے ہیں۔

موہن لال۔ تو دھرم یا انصاف وہی ہے جو عقل اور دلائل کی کسوٹی سے پورا اُترے؟

جج۔ ہاں۔ سماج اسی کو انصاف تسلیم کرتا ہے، جو ہمدردی کا فیصلہ نہ ہو، دشمنی کا فیصلہ نہ ہو، جو ایک ایسا فیصلہ ہو جس میں انسان کا ذہن خامی نہ نکال سکے۔ تمہارا فیصلہ ہمدردی اور جانبداری کا فیصلہ تھا۔ اسی لئے وہ فعل جسے تمہاری آتما نے انصاف یا دھرم کی خدمت کہا، ایک قتل ہے، اور قتل کی سزا موت یا عمر قید ہے۔

(فلیش بیک ختم)

رامداس۔ اور یہ سزا اُسی قتل کے الزام میں کاٹ رہے ہو؟

موہن لال۔ ہاں اسی قتل کے الزام میں، جسے میری آتما نے دھرم اور انصاف کا فعل بتایا تھا۔

رامداس۔ لیکن موہن لال، تم یہ بھول بیٹھے ہو کہ اس عدالت کا فیصلہ آخری نہیں ہے۔

اس سے بھی بڑی ایک عدالت ہے، جو سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر معصوم اور نیائے کرتی ہے؟

موہن لال۔ (طنز سے) وہ کہاں ہے؟ اگر موجود ہے تو میں یہاں کیوں ہوں؟

رامداس ۔ وہ اوپر ہے۔ وہ بھگوان کی عدالت ہے۔ وہ تمہارے ساتھ کبھی انصاف کرے گی۔ کیا تم نے نہیں سُنا کہ عدالت نے ایک ملزم کو رہا کر دیا۔ لیکن عدالت سے باہر آتے ہی اس پر بجلی گری۔ اسے سانپ نے ڈس لیا۔

موہن لال۔ سُنا ہے۔ لیکن اگر یہ ایک اتفاق نہیں ہے تو پھر عدالتوں کے باہر رات دن بجلیاں کیوں نہیں گرتیں؟ سانپ پھن اٹھائے کیوں نہیں لہراتے؟

رامداس۔ (محض کچھ نہ کچھ کہنے کی غرض سے) شاید... شاید کہ پاپ کا گھڑا پوری طرح بھر جائے اور تب ڈسے۔

موہن لال۔ (نفرت اور بغاوت سے چلتے ہوئے ہیں) رامداس تم نے الم غلم خیالات کی گولیاں شاید اندھا دھند کھا لی ہیں۔ تبھی تم ایسی باتیں کر رہے ہو۔ کیا تم اس لئے ان کو بھگوان کہتے ہو، جو اس انتظار میں ہے کہ معصوم مرتے رہیں، مجرم پنپتے رہیں اور جب دنیا میں صرف مجرم ہی رہ جائیں یا تمہارے الفاظ میں پاپ کا گھڑا پوری طرح بھر جائے تب وہ آئے اور اپنے انصاف کی بجلی سے اس ہستی کو جلا کر خاک کر دے۔ رامداس اگر تمہارا بھگوان ایسا ہی ہے تو وہ اس سپاہی کی طرح گولی سے اڑا دینے لائق ہے، جو اس انتظار میں کھڑا رہتا ہے کہ پہلے مجرم جرم کا ارتکاب کر لے۔ اس کے بعد وہ عمل میں آئے گا۔

رامداس۔ (خوف سے کانوں پہ ہاتھ رکھ کر) ایسے نہ کہو موہن لال، ایسے نہ کہو۔ میرے ایمان کی دیوار دل کو اس طرح مت جھنجھوڑ دو۔ میں ایک جنگلی آدمی ہوں۔ تم نے کبھی ٹھیک کہا تھا کہ نہیں، وہ انگارے نہیں تو تمہارے ہاتھوں میں کھلیان کے پیچ

رکھا ہُوا ہے۔ بڑی مشکل سے مَیں نے پرماتما کے نام اور آتما کے گیان سے اس آگ کو بُجھایا ہے۔ آتما اور پرماتما کی بے بنیاد دی بتا کر اس آگ کو پھر نہ بھڑکاؤ۔

موہن لال۔ لیکن تم اپنی آگ بُجھاتے کیوں ہو؟ آگ کا انجام راکھ ہی تو نہیں ہے۔

رامداس۔ تو کیا ہے؟ آگ کھلیاں کو بھی نہ جلائے اور راکھ بھی نہ بنے تو کیا کرے؟

موہن لال۔ روشنی دے۔ سامنے جلتی ہوئی اس لالٹین کی طرح جو آگ ہوتے ہوئے بھی جلاتی نہیں، روشنی دیتی ہے۔ رام داس جو آگ تم میں جلتی ہے اُسے بُجھانے کی ہرگز کوشش نہ کرو۔ یہ زندگی کی وہ خالص اور مقدس آگ ہے جو اس دُنیا میں زندگی اور تعمیر کی روشنی کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔

رامداس۔ (حیران ہوکر) تم کیا کہہ رہے ہو موہن لال؟

موہن لال۔ جو اس کائنات کا راز ہے۔ رامداس جس میں زندگی کی آگ ہے، وہی زندگی سے محبت کر سکے گا اور جو محبت کرے گا وہی ایک عاشق اور ایک باپ بنے گا۔ وہی اس دُنیا کو ایسے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرے گا، جس میں اُس کی محبوبہ محبت کے زندگی بھر گیت گا سکے اور بیٹا بے خطر زندگی کے ڈگ بھر سکے۔

رامداس۔ (جیسے روشنی دیکھ لی ہو) موہن لال۔

موہن لال۔ ہاں رامداس۔ کل جب تم یہاں سے جاؤ تو راکھ لیکر نہ جاؤ۔ اپنے سینہ میں زندگی کے ارمانوں کی دہکتی آگ لے کر جاؤ۔

رامداس۔ لیکن اس آگ سے روشنی کیسے حاصل کروں؟ اگر آتما نہیں دیا نہیں دھرم نہیں تو اس آگ کو کیسے قابو میں رکھوں؟ اس آگ کی لپٹوں سے دوسروں سے کیسے بچاؤں؟

موہن لال۔ اپنے دماغ کی مدد سے۔ رامداس جس کو تم آتما، دیا اور دھرم کہتے ہو، دراصل وہ کچھ نہیں ہیں۔ وہ محض خیال کی چمنیاں ہیں، جن سے آدمی اپنے اندر کی آگ کو قابو میں رکھ کر روشنی میں بدلتا آیا ہے لیکن اِک چمنی ہمیشہ کام نہیں دیتی۔

آگ جیسے جیسے تیز ہوتی ہے، پُرانی چمنیاں چٹخ کر بیکار ہونے لگتی ہیں، وہ روشنی کے بجائے آگ کو دھوئیں میں بدلنے لگتی ہیں۔ تم دھواں دینے والی چمنی کے چکّر میں نہ پڑو۔

رامداس۔ تو نئی چمنی کہاں سے لاؤں؟

موہن لال۔ اپنے ذہن سے، رامداس دماغ کی بھٹّی سے ہر گھڑی خیال کی نئی نئی چمنیاں ڈھل کر نکلتی رہتی ہیں۔ تم اپنے اندر کی آگ کو تیز اور تیز تر کرنے سے قطعی نہ جھجکو۔ صرف اتنا خیال رکھو کہ جب خیال کی کوئی چمنی چٹخ کر روشنی کے بجائے دھواں دینے لگے، تم آگ کو راکھ کرنے کی نہ ٹھالو۔ محض دماغ کی طرف ہاتھ بڑھا کر خیال کی ایک نئی چمنی حاصل کرو اور اسکی مدد سے آگ کو روشنی کے پھولوں میں کھلا ڈالو۔

(یکایک دُور سے ریل کی آواز آتی ہے)

رامداس۔ (چونک کر) یہ کیا؟ —— کیا صبح والی گاڑی آگئی؟

موہن لال۔ ہاں رامداس —— اور اُدھر بھی دیکھو پو پھٹنے کی اور ——

رامداس۔ (مسرت سے) اوہ۔ پو پھٹنے لگی ہے۔

موہن لال۔ ہاں روشنی اور رہائی دونوں کی گھڑی آرہی ہے۔ وہ دیکھو، وہ آرہے ہیں، شائد تمہیں رہا کرنے۔

(سنتری قریب آتے ہیں اور تالہ کھولتے ہیں)

سنتری ۱۔ رامداس تیار ہو جاؤ۔ ہم لینے آئے ہیں۔

سنتری ۲۔ تمہاری رہائی کے کاغذ تیار ہیں۔ دفتر چلو۔

رامداس۔ (مسرت اور شادکامی کے گہرے جذبہ سے) موہن لال۔

موہن لال۔ جاؤ میرے دوست کہ زندگی کے بہت سے خوبصورت دن ابھی یہاں

سے باہر تمہارا انتظار کرتے ہیں۔

رام داس۔ لیکن اکیلا (یکایک محسوس ہوتا ہے) موہن لال میں اکیلا کیسے چلوں گا۔

موہن لال۔ تم اکیلے نہیں چلو گے موہن لال۔ پھاٹک سے نکلتے ہی زندگی لپک کر تمہارے ہاتھ تھام لے گی۔ تم بھی اس کے ہاتھ پوری شدت سے تھام لینا، کیونکہ زندگی سے زیادہ خوبصورت اور بھروسے کے قابل محبوبہ پوری کائنات میں کوئی دوسری نہیں ہے۔

رام داس۔ (زندگی سے لبریز لہجے میں) موہن لال۔

موہن لال۔ جاؤ میرے دوست جاؤ کہ صبح کی گاڑی آ گئی ہے اور اسٹیشن پر تمہارا انتظار کر رہی ہے — جاؤ — جاؤ۔

(رام داس ایک نئی روشنی، ایک نئی امید سے دمکتا ہوا چہرہ لیکر کوٹھڑی سے باہر نکلتا ہے — بڑی گرمجوشی سے موہن لال کا ہاتھ کچھ دیر اپنے ہاتھ میں لے کر چل پڑتا ہے — اپنی نئی زندگی کی سمت۔